اردو ادب میں "ماں" پر ایک شاہکار تحریر
میا
ایوارڈ یافتہ
محمد حامد سراج

حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جو شخص رزق کی کشادگی اور عمر کی زیادتی کا
خواہش مند ہو، اُس کو چاہیے کہ صلہ رحمی کرے
اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔''

(مسند احمد، الادب المفرد)

اُردو ادب میں ''ماں'' پر ایک شاہکار تحریر

میّا

محمد حامد سراج

بک کارنر

شوروم: بالمقابل اقبال لائبریری بک سٹریٹ جہلم پاکستان

فون نمبر 0544-614977 موبائل 0323-5777931

پرنٹرز۔ پبلشرز۔ کمپوزرز۔ ڈیزائنرز۔ بک سیلرز۔ ہول سیلرز اینڈ لائبریری آرڈر سپلائیرز

Mayya
By: Muhammad Haamid Siraj
Jhelum: Book Corner. 2015
160p.
1. Urdu Literature
ISBN: 978-969-662-003-7

اشاعت : ۲۰۱۵ء

نام کتاب : میّا

مصنف : محمد حامد سراج

حروف خوانی : پروفیسر سیّد امیر کھوکھر

تزئین واہتمام : گگن شاہد۔ امر شاہد

سرورق : محمود فرشچیان

مطبع : زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

محمد حامد سراج
ڈاکخانہ چشمہ بیراج، ضلع میانوالی، پوسٹ کوڈ 42030
ای میل: hamidtaloker@gmail.com
موبائل: 0333-6833852

کے نام

چوں اویس از خویش فانی گشتہ بود
آں زمینی آسمانی گشتہ بود

ترجمہ: چونکہ حضرت اویس ؒ فنافی الذات ہو گئے تھے
لہٰذا وہ زمین آسمان بن گئی تھی۔

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نواسے

سیّد ذوالکفل بخاری رحمۃ اللہ علیہ

کے نام

جنہوں نے اس تخلیق کا نام

''میّا''

تجویز فرمایا

نثار روئے تو ہر برگِ گل کہ در چمن ست
فدائے قدِ تو ہر سرو بن کہ بر لبِ جوست

ترجمہ: آپ کے چہرے پر باغ کے تمام پھولوں کی پتیاں نثار ہوں۔
(اور) آپ کے قد پر تمام سرو، جو نہر کے کنارے پر ہیں، فدا ہوں۔

ترتیب

مِیّا: حامد سراج کا ایک جمالیاتی شاہکار

"ماں۔۔۔

یہ شام، اداسی اور تنہائی کا لامتناہی صحرا

تم وقت کی قید سے ورے جا آباد ہوئیں۔

اور میں۔۔۔

ہجر کے پیڑ تلے بیٹھا اپنی باری کا انتظار کر رہا ہوں۔"

یوں تو پیشِ نظر اقتباس حامد سراج کی "میّا" کا پورا تھیم اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے لیکن میّا کا مطالعہ ایک حیرت انگیز تجربہ ہے۔ مختصر کینوس کے باوجود یہاں زندگی کے بے شمار رنگ موجود ہیں۔ یہاں زندگی کا جبر ہے اور اس کی رعنائیاں بھی۔ زندگی اور موت کا فلسفہ بھی ہے اور دونوں کے درمیان معلق، تڑپتا ہوا انسانی وجود بھی۔ سیاسی شعور بھی ہے اور حاکم و محکوم کے فرق اور جنگ کے نتائج کی طرف موہوم سا اشارہ بھی۔ خدا کی برتری اور زندگی کے ہاتھوں ملنے والے ان جانے دکھ بھی۔ مریض کی زندگی کے ختم ہوتے ہوئے ہر لمحے کے ساتھ اس کے تیمارداروں کی کھوکھلی ہوتی روحیں اور ذہنی موت بھی۔ بے لوث و بے غرض دوستی اور وفا کا بیان بھی اور یہاں نئے زمانے کی نیرنگی بھی ہے اور گزرے زمانے کے شب وروز کی کشش اور حسرت ناکی بھی۔

گو کہ اس تحریر کی پوری فضا سوگوار ہے لیکن مختلف زاویے سے کھینچی گئی ماں کی تصویر دلوں کو شاداب کرتی ہے۔ نہ یہ افسانہ ہے نہ ناول، نہ داستان نہ ڈرامہ۔ نہ انشائیہ نہ خاکہ۔ خالص جذبات و احساسات کا خوب صورت بیان ہے، ایک بیٹے کی بے پناہ محبت کا اظہار، جو کسی بھی رائج صنف کی محتاج نہیں۔ بلکہ کہنا یوں چاہیئے کہ یہ ایک نئی صنف کی آمد ہے۔ حقیقت نگاری اس کی بنیاد ہے لیکن انداز افسانوی ہے۔ اور بیان ایسا دلکش کہ اس کے سحر میں قاری کھو سا جاتا ہے۔ ۱۱۸ صفحات پر مشتمل اس تحریر کے مطالعے سے ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ مصنف نے کتنے قریب سے زندگی کا ادراک کیا ہے۔ یہاں ایک طرف ماں کی ممتا ہر پل نئے رنگ میں چھلکتی ہے تو محبت کے جذبے سے تڑپتا ایک بیٹے کا دل بھی ہے۔ لمحہ لمحہ موت کی جانب کوچ کرتی زندگی ہے تو اس زندگی کو اپنی تمام تر قوت سے موت کے ہاتھوں سے چھین لینے کی ایک بیٹے کی بے سود کوشش، اور اس کوشش میں ہاتھ آئی ناکامی و نامرادی کی گہری کھائی میں گم ہوتا اس کا وجود۔ زباں خاموش، بے بسی کا عالم ہے:

"ماں۔۔۔

میں اس بات کا اظہار کیسے کروں۔ اندر کے اس دکھ کو زبان کیسے دوں۔۔۔؟

کہ جب انسان کے اندر کسی کی موت کا بیج اگنے لگے تو کیا کیفیت ہوتی ہے۔ یہ پودا روح کی زمین کا سینہ چیر کر کیسے باہر نکلتا ہے۔ اور پھر اس پر لہو کی بوند سے کیسے پھول کھلتے ہیں۔"

انسان تا عمر زندگی اور موت کے اسرار و رموز کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ یہ کوشش اسے ہمیشہ بے چین رکھتی ہے۔ یہ بے قراری کبھی نہ ختم ہونے والی بے قراری ہے۔ کسی اپنے عزیز کی موت کا تصور، اس کی موت اور پھر اس کے بعد کا سناٹا۔ آدمی تب تک ان کے گرد چکر کاٹتا رہتا ہے جب تک خود اپنے پیچھے وہی بے قراری نہ چھوڑ جائے۔

حامد سراج کی "میا" اس ماں اور اس کی زندگی سے متعلق واقعات کا بیان ہے جو کینسر کی مریضہ ہے۔ کینسر کا اثر نہ صرف مریضہ پر ہے بلکہ اس کا زہر پوری فضا میں پھیلا ہوا

محسوس ہوتا ہے۔ ہر دل کو سکون و آرام پہنچانے والی جب خود بے سکون ہے تو کوئی کس طرح سکون پا سکتا ہے۔ اور جب ماں کا وجود رفتہ رفتہ بیٹے کی نظروں کے سامنے سے اوجھل ہوتا جاتا ہے تو اسے اپنا وجود بھی کہیں صفر ہوتا ہوا محسوس ہونے لگتا ہے۔

''موت ایک اٹل حقیقت ہے۔

کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْت

لیکن ایک سواتی دن پہلے ہی یہ خبر کیوں۔۔۔؟

موت سے پہلے مرجانا کسے کہتے ہیں۔ کوئی ہم سے پوچھے۔۔۔؟''

میتا کے پہلے صفحے پر ہی آنے والا یہ جملہ ''بیٹا۔۔۔۔ میری بھوک مر گئی ہے۔'' اس پورے بیانیہ کی سوگوار فضا کا پتا دیتا ہے۔ اس کے بعد ماں کے بیمار ہونے اور پھر مرض کی تشخیص اور آخری انجام یعنی موت تک کا بیان مصنف نہایت جذباتی لہجے میں کرتا ہے۔ یہ بیان یوں تو بہت مختصر عرصے پر محیط ہے، لیکن فلیش بیک اور شعور کی رو کی تکنیک اسے کئی سالوں کے عرصے تک پھیلاتی ہے۔

مصنف یاد در یاد کی کیفیت سے بار بار گزرتا ہے۔ ماضی کا یہ سفر قاری کو کچھ وقفے کے لیے حال سے غائب کر دیتا ہے۔ وہ وقت جو مستقبل کی تلاش میں مستقل نئے نئے راستوں پر چلتے چلتے کہیں پیچھے رہ گیا تھا، وہ ایک دم سے زندہ ہو اٹھتا ہے۔

''یاد ہے ماں۔۔۔ چھپر میں پرندوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ ساری دوپہر چڑیاں اپنے بچوں کے لیے دانہ دنکا چن کے لاتی تھیں۔ چھپر کے ساتھ متصل شرینہہ کا درخت تھا۔ اس کے تنے میں کالی بھڑوں کا بسیرا تھا۔ ان کی بھنبھناہٹ ان کے ڈنک سے بھی زہریلی محسوس ہوتی تھی۔ دادی اماں آگ جلانے کے لیے چھپر کے نیچے خشک لکڑیوں کا ذخیرہ محفوظ رکھتیں۔ بارش کے دنوں میں ان کو اس بات کی بہت فکر رہتی تھی۔''

غور طلب ہے کہ جہاں ہمارے لیے یہ ماضی کا حصہ محض ہے، مصنف اسے آج

یعنی حال سے تعبیر کرتا ہے۔ ''ماں۔۔۔یاد ہے۔۔۔یہ آج کی بات ہے۔کیوں کہ میرے اندر آج زندہ ہے۔'' اور اس بات کی تصدیق گزرے ہوئے ایک ایک لمحے کی زندہ تصویر سے ہوتی ہے جو مصنف نے پیش کی ہے۔یوں ماضی اور اس کی وراثت مصنف کے اندر آج بن کر محفوظ ہے اور یہ ایک صحت مند ذہن کی دلیل ہے۔کیوں کہ یادیں ہی انسان کی وراثت کو محفوظ رکھنے کا واحد ذریعہ ہیں۔اگر یہ نہ ہو تو آدمی بے معنی ہو جاتا ہے۔

انھیں یادوں کے ذریعے مصنف اپنی ماں کی شخصیت کے مختلف پہلو ہم پر آشکار کرتا ہے اور بے ساختہ ہمارے ذہنوں میں بھی اپنی ماں کی تصویر ابھر آتی ہے۔ماؤں کی کچھ صفات مشترک ہوتی ہیں اور یہی اسے عظمت بھی عطا کرتی ہیں لیکن حامد سراج نے ماں کی ان خصوصیات کے بیان میں احساس کا کچھ ایسا رنگ بھرا ہے کہ حامد سراج کی میّا نہ صرف اپنے فرزند کے بلکہ ہم سب کے دلوں میں ہمیشہ کے لیے ایک خاص مقام محفوظ کر لیتی ہے۔میّا کی تخلیق اپنی ماں کو ابدی زندگی عطا کرنے کی ایک شعوری کوشش ہے کیوں کہ مصنف کے نزدیک ماں کے بغیر زندگی کا تصور ناممکن ہے۔

''تمہارے بعد یہ زندگی بے ترتیب ہو گئی ہے۔ریزہ ریزہ زندگی کو کیسے ترتیب دیا جائے۔آنسوؤں کو کس تاگے میں پرویا جائے۔''

میّا کو یقیناً مصنف نے آنسوؤں میں ہی پرویا ہے اور اس طرح زندگی کو ترتیب دینے اور بکھرے وجود کو سمیٹنے کا سامان فراہم کیا ہے۔ماں جب اس عالم بے ثبات سے رخصت لیتی ہے تو مصنف اپنی ماں کے ساتھ گزارے ایک ایک لمحے کو اپنی زبان و بیان کے ذریعے ایک نئی شکل دیتا ہے اور اس طرح ماں کو ایک نئی اور ہمیشہ قائم رہنے والی زندگی ملتی ہے۔اگر ہم اس کے مختلف واقعات پر غور کریں تو بعض اوقات ہمیں یہ غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں، مثلاً بن کہے ماں کا سب کچھ سمجھ لینا، اس کی مہمان نوازی، آخری سانس تک نہ صرف بیٹے (بچوں) کی، بلکہ تمام عالم انسانی کی فکر وغیرہ۔لیکن جب مجموعی طور پر ہم اس تخلیق کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر واقعہ فطری طور پر بیان ہوا ہے۔کوئی

ملاوٹ، تصنع یا آرائش کا شائبہ بھی نہیں۔ اور یہی واقعات ماں کی شخصیت کو ابھارنے میں معاون ہوتے ہیں۔

فن اور تکنیک دونوں کے اعتبار سے میا ایک جدید تجربہ ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ اس تخلیق کو موجودہ کسی صنف میں داخل نہیں سمجھا جا سکتا۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنے آپ میں یہ ایسی تحریر ہے جو ایک جدید ذہن کی عکاسی کرتی ہے۔ جیسے ہی ہم جدید لفظ کا استعمال کرتے ہیں، یہ امر یقینی ہو جاتا ہے کہ یہ کسی بھی مروجہ راستے پر چلنے کی بجائے کسی نئی راہ کی طرف اٹھایا ہوا قدم ہے۔ میا اسی نئی راہ کی تلاش کا نام ہے۔

اس بیانیہ کا ایک اور اہم تجربہ اس کا حاضر راوی (Second Person Narrator) کے ذریعے بیان ہونا ہے۔ مصنف کا تخاطب ہمیشہ اپنی ماں سے ہے۔ یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں ہے۔

- ''ماں۔۔۔تم نے باورچی خانے کی کھڑکی کی جالی پر دونوں ہاتھ رکھے اور اوک میں سے جھانکتے ہوئے کہا۔''
- ''ماں۔۔۔تمہاری پشت پر بوڑھا برگزیدہ شیشم رو رہا تھا۔''
- ''ماں۔۔۔تمہاری آنکھوں میں زردی اتر آنے سے درختوں کے پتے زرد ہو گئے۔''
- ''ماں۔۔۔اٹامک انرجی ہسپتال چشمہ سے جب تمہیں اسلام آباد ریفر کیا گیا تو تم نے کہا۔''
- ''ماں جب تمہیں آپریشن کا لباس پہنا کر۔۔۔''
- ''ماں۔۔۔مجھے یاد ہے میں نے تم کو لکھا تھا۔''

ان مثالوں کو دیکھتے ہوئے ہم بہ آسانی یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ یہ بیان صیغہ حاضر کی واضح مثال ہے۔ اگر مغرب کے ادب پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ایک دو نمونے، Jay Mc Inerney کا Big City, Bright Light یا Tom Robbin کا Half

جن میں ہمیں تخلیق سے پہلے ہی جکڑ دیا گیا تھا۔

پھر بھی۔۔۔ایک آس، امید، چراغ، روشنی۔حوصلہ۔۔۔"

- "گھر کی ایک ایک اینٹ میں ماں کی یاد موجود ہوتی ہے

دیواریں بولتی ہیں

دروازے پکارتے ہیں

راستے

جن سے ماں گزرتی تھی

بین کرتے ہیں

پوری زمین ماں کی لحد میں بدل جاتی ہے۔

تم کہاں چلی گئی ہو۔۔۔؟"

اس تحریر کی تمام خصوصیات کے ساتھ ہی ماں کی شخصیت کی ایک کمی بار بار کھٹکتی ہے، وہ ہے اس کا جسمانی رنگ وروپ۔ کسی کی شخصیت کے واضح نقوش اس کے جسمانی خط وخال سے ابھرتے ہیں، لیکن یہاں مصنف کی ایسی کوئی کوشش نظر نہیں آتی۔لہٰذا کسی واضح شخصی تصویر کی بجائے ایک ماں کے وجود کا دھندلا سا عکس، ایک احساس باقی رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مصنف ایک لمحے کے لیے بھی قاری کی نظروں کے سامنے سے نہیں ہٹتا۔شروع سے آخر تک مصنف اس تصنیف پر غالب نظر آتا ہے۔ایسے میں ماں کی شخصیت مصنف کے مقابلے دب جاتی ہے۔اب اسے اس کتاب کی خوبی کہیں یا نقص لیکن یہ امر حقیقی ہے کہ اس کا مطالعہ ماں کی ذات سے زیادہ مصنف کی ذات میں دلچسپی پیدا کرتا ہے۔یہاں ماں کا وجود ثانوی نظر آنے لگتا ہے جب کہ مصنف پوری تحریر پر چھایا ہوا ہے۔

ڈاکٹر روبینہ پروین

علی گڑھ یونیورسٹی

rubina.urdu.amu@gmail.com

''میّا'' اسلوب کا نیا تجربہ

محمد حامد سراج کی ''میّا'' تمام اصناف ادب کے دائروں سے باہر نظم ونثر کے تمام پیمانوں سے ماورا...... ایک انوکھی تحریر......... درد میں ڈوبا ایک لمحہ......... ہجر ووصال کے درمیان ڈولتا ایک پل......... ماں کی ذات سے جڑا محبت کا وہ رشتہ جسے دُنیا کا کوئی تخلیق کار لفظوں میں نہیں پرو سکتا۔ یہ حامد صاحب کا کمالِ فن ہے کہ ماں کی ذات سے جڑی ہر چیز کو نوکِ قلم پر رکھ دیا ہے۔

ماں کا لمس......... اُس کے قدموں سے سجا آنگن......... اُس کی یادوں سے آباد بچپن......... اُس کی محبت سے روشن وجود کی بوسیدہ عمارت......... اُس کے جانے کے بعد گھر کے آنگن میں اُترتی ویرانی......... آنسوؤں میں بھیگے سارے منظر......... درد کی تفہیم سے درد کی تقسیم تک جتنے پل تھے وہ ''میّا'' کی سطر سطر میں بکھر گئے۔

اِس ماں کے چھن جانے پر دیوارِ ہستی پر جو لرزہ طاری ہوتا ہے ''میّا'' اُس واردات کا بیان ہے۔ ماں کے بِنا انسان کیسے تنہا ہوتا ہے ''میّا'' اُسی تنہائی کا نوحہ ہے۔

''میّا'' پڑھتے ہوئے قاری جہاں درد کی کئی مسافتوں سے گزرتا ہے وہیں پر اسلوب کے نت نئے رنگ اسے اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ کسی پل عبارت پر نظم کا گماں گزرتا ہے......... کہیں متن افسانے کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے......... کچھ سطروں میں گیتا کے اشلوک ڈھکے چھپے نظر آتے ہیں......... کبھی خیال داستانوی ادب سے جا ٹکراتا

ہے۔.........کوئی صفحہ کسی مقدس صحیفے کا گم شدہ ورق لگتا ہے.........کبھی کتاب صوفیانہ ادب کا حصہ لگتی ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ پتا ہی نہیں چلتا کہ کب نظم نثر کے پیرائے میں ڈھل گئی؟.........کب افسانہ مکالمہ بنا؟.........کب خود کلامی سفر کرتی خطاب کرنے لگتی ہے.........ادب کی ساری حد بندیاں ''میا'' میں زیروزبر ہوتی نظر آتی ہیں اور یہی کلاسک ادب کا معیار ہے۔

''میا'' کا انتساب بھی بڑا معنی خیز ہے.........کتاب اُٹھاتے ہی خیال آتا ہے کہ جس کے نام سارا متن ہے انتساب بھی اُسی کے نام ہوگا......مگر انتساب صحابیٔ رسول ﷺ خواجہ اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کے نام ہے......ایک بیٹا......اپنی ماں کی یادیں، باتیں ایک ایسے بیٹے کا نام کر رہا ہے جو خود ماں کی محبت کا اسیر تھا.........جس نے اطاعت وفرمانبرداری کا وہ باب رقم فرمایا کہ عقل حیران ہوتی ہے مگر وہ اپنے عشق میں سرخرو رہا۔

''میا'' بھی ایک محبت کرنے والے فرمانبردار بیٹے کی روداد ہے.........اکثر بیٹے ماؤں کو قبر میں اُتار کر خالی ہاتھ لوٹ آتے ہیں.........حامد صاحب وہ بیٹے ہیں جو اپنی ماں اپنے وجود میں سمیٹ کر اپنی تخلیق میں لے آئے.........اپنے ہنر میں زندہ کر دیا۔

سمیرا نقوی

لائل پور

میّا۔۔۔نئے اُفق کی دریافت

میانوالی کے معروف قصبہ کندیاں سے سات کلومیٹر کے فاصلے پر جنوب مشرق میں تصوف کے سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ سے منسوب جیتی جاگتی بستی خانقاہ سراجیہ واقع ہے۔ روحانی کیفیات سے سرشار، شانت، پرسکون اور دھیمے مزاج کی اس بستی کی بنیاد حضرت مولانا ابوالسعد احمد خانؒ نے 1918ء کے لگ بھگ رکھی۔ اور اسے خانقاہ موسیٰ زئی شریف ضلع ڈیرہ اسماعیل خان کے اپنے شیخِ وقت ولیٔ کامل حضرت خواجہ سراج الدینؒ کے اسمِ متبرک سے موسوم کردیا۔ شاداب کھیتوں اور سرسبز درختوں کے درمیاں سانس لیتی یہ بستی۔۔۔علمی اور روحانی تشنگی بجھانے والوں کے لیے چھیاسی برس سے فیوض و برکات کا سرچشمہ بنی ہوئی ہے۔ اس قریہ خوش جمال کی تاریخی لائبریری اگر دینی اور متصوفانہ حوالے سے افسانوی حیثیت حاصل کرچکی ہے تو آیاتِ قرآنی کے سرمدی نغموں سے گونجتی اس کی قدیمی مسجد ایک عرصے سے سجدہ گزار اور شب زندہ دار نفوسِ قدسیہ کی توجہات کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ بستیاں سنگ وخشت، درودیوار اور کوچہ و بازار سے نہیں، غیر معمولی شخصیات سے آبرومند اور سربلند ہوا کرتی ہیں۔ کیسی کیسی بستیوں نے کیسی کیسی ہستیوں کو جنم دیا سوچیں تو ذہن کے ایوان میں چراغ جگمگانے لگتے ہیں۔ باباجی حضرت قبلہ امیر مرکزیہ عالمی مجلس تحفظ ختمِ نبوت خواجہ خان

محمد صاحبؒ اس خوش نہاد بستی کا اعزاز تھے جو روحوں میں سحر کی تنویر بوتے اور دلوں میں اطمینان کی چاندی کاشت کرتے ہیں۔ وہ اس بستی کی روحانی روشنی کا راز اور اس کی حیاتِ جاوداں کا جواز تھے۔ مربوط معمولات کے سانچے میں ڈھلی اس حیات آفریں شخصیت میں ایک عجیب سی مٹھاس، ٹھنڈک، ٹھہراؤ اور دل پذیر جاذبیت گھلی ہوئی تھی۔ وہ اس بستی کے افق پر دمکنے والا ایسا آفتابِ جہاں تاب تھے جس کی کرنوں سے بے شمار افراد اکتسابِ فیض کرتے رہے۔ اس نور و سرور بستی کے گھروں میں ایک گھرانہ باباجیؒ کے اجداد کی علمی روایتوں کا بہترین امانت دار ہے۔

صاحبِ خانہ محمد حامد سراج کا کتب خانہ ادبیاتِ عالیہ اور دیگر متنوع موضوعات کی کتب سے مزین ہے۔ کتب خانے کی ہر دیوار کے ساتھ ایستادہ Book Shelf میں آراستہ کتابیں صاحبِ خانہ کے حسنِ انتخاب اور ذوقِ مطالعہ کا واضح ثبوت ہیں۔ کتب خانے میں داخل ہو جائیں تو کتابوں کی کیف آور معیت میں وقت گزرنے کا احساس تک نہیں ہوتا۔ صاحبِ خانہ کا شوقِ مطالعہ اور کتب اندوزی کا جنون اس کتب خانے کی سرعت انگیز وسعت پذیری کا سب سے بڑا محرک ہے۔ اپنے دار المطالعہ کے گوشۂ عافیت کی معطر تنہائی میں عزلت گزیں محمد حامد سراج معاصر افسانوی ادب کا ایک ایسا نام ہے جس نے نہایت قلیل عرصے میں ادبی دنیا کو افسانے کے افسوں میں گرفتار کر لیا ہے۔ محمد حامد سراج کے اولین افسانوی مجموعے "وقت کی فصیل" نے زمان و مکان کی حدود عبور کر کے فن کی بلندیوں کو چھو لیا ہے۔ ڈاکٹر افتخار مغل نے محمد حامد سراج کی افسانہ نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے بجا طور پر اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ:

> "اردن دھتی رائے سے محمد حامد سراج تک عظمت انسانی کا اعتراف شاہراہِ وقت کا ایک سنگِ میل ہے جس کے دونوں طرف ایک جیسے فاصلے اور ایک جیسے فیصلے درج ہیں۔ یہاں سے ماضی بھی Zero Distance پر ہے اور مستقبل بھی۔۔۔!

محمد حامد سراج ماں سے وابستہ یادوں کو تاثر اور تاثیر سے لبریز اندازِ بیاں کے نپے تلے جملوں میں یوں بُنتے چلے گئے ہیں کہ پڑھنے والا اس سحر میں گم ہوتا چلا جاتا ہے۔ وہ جملوں کی پاور آف مسمریزم کے کامل شناور ہیں۔ اور اسے بھرپور انداز میں بروئے کار لاتے ہیں۔ اسلوبیاتی نقد و انتقاد میں کسی بھی تخلیق کار کا تجزیہ طویل تکنیکی مباحث کو محیط ہے۔ یہاں ان مباحث سے تعرض کی گنجایش نہیں تاہم محمد حامد سراج کے اسلوبِ تحریر کی چند نمایاں خصوصیات کی نشان دہی ان کے لکھے خاکہ کی تفہیم کے لیے ناگزیر ہے۔ اس لیے ان سطور میں ان پر ضرور بات ہوگی۔

''میّا'' خود کلامی اور مکالماتی تکنیک میں لکھا گیا خاکہ ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے مکالماتی تکنیک اور مخاطبی اسلوب پر بحث کرتے ہوئے تحریر میں اِسمیّت (Nominalization) اور فِعلیّت (Verbalization) کا موازنہ پیش کیا ہے۔ اور اسلوبِ تخاطب میں فعلیت کو لازم قرار دیا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ تخاطب میں صرف کلمہ اسمیہ سے کام نہیں چلتا، بات کے مکمل ابلاغ اور ترسیلِ معنی کے لیے گفتگو میں فعلیت کے بروئے کار آنے کے لیے راہ کھل جاتی ہے۔ جہاں تخاطب کی کیفیت اور مکالماتی فضا ہوگی فعلیت ضرور ہوگی کیوں کہ اسمیت میں اسلوبیاتی تنوع کا زیادہ امکان نہیں۔ فعلیت میں تنوع کے امکانات لامحدود ہیں اور صاحبِ اسلوب ان امکانات سے بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے۔ سچے فعلیہ اسلوب کی تخلیق اسمیہ اسلوب سے زیادہ مشکل ہے۔ اس میں تہہ داری اور معنی آفرینی کی زیادہ گنجایش ہے۔ خاکہ نگار نے اس خاکے میں فعلیہ اسلوب سے نہایت عمدگی سے استفادہ کیا ہے چنانچہ ان کے خاکہ میں معنویت اور تہہ داری کی خصوصیات واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہیں۔۔۔ یہ مکالمے اس ساری بحث کی گواہی دیں گے:

- ''ماں تم کمرے میں تھیں

  اور میرے پہلو میں لگی پلاسٹک کی نالی سے لہو رستا تھا۔

  باہر پائن کے درختوں میں اداس ہوا سرسراتی تھی۔''

”ماں۔۔۔یہ لوٹ جانے کا عمل نہ ہوتا تو شاید قلوب گداز نہ ہوتے۔جدائی جہاں دل میں ویرانی کاشت کرتی ہے وہیں سوز و گداز کے پھول کھلاتی ہے۔“

خیالات کا اسلوب اور نثری پیکر سے جسم اور روح جیسا تعلق ہوتا ہے۔اس لیے کسی نثر نگار کو پرکھنے کے لیے معیار یہ ہے کہ اس نے کیا کہا۔اس کے خیالات، اس کی لفظیات اور اسلوب آپس میں ہم آہنگ ہیں یا نہیں۔خاکہ نگار نے اپنے خیالات کو اس خاکے میں نثر کے سانچے میں اس طرح ڈھالا ہے کہ اس کی تحریر فکر و فن کی اکائی و یکتائی کا مظہر بن گئی ہے۔۔بڑی شاعری اور نثر کا وصف یہ ہے کہ وہ اپنا پیکر خود تیار کرتی اور اپنا اسلوب خود وضع کرتی ہے۔۔اس کی سند کے لیے اساتذہ ماقبل کے ہاں تلاش پر اصرار لسانی شعور و آگہی کے منافی ہے۔محمد حامد سراج نے اس خاکہ کے لیے زبان کا ایک منفرد اور جدید قالب تیار کیا ہے۔جس میں مقامی لہجے کا ذائقہ اور مٹھاس سرایت کرتی چلی گئی ہے۔ٹانچی، ٹالی، ڈلہا والا کمرہ، شرینہہ، کھوہ، اندھی ڈل، کٹوی، پرات، ابھار والا کمرہ، وچالے والا کمرہ اور پرسال جیسے مقامی الفاظ کا استعمال زبان کا نیا اور وسیع پیکر تراشنے کی کامیاب کاوش ہے۔خاکہ نگار کو زبان کے خلاقانہ استعمال کی بھرپور استعداد حاصل ہے۔ان کی زیرِ تبصرہ تحریر کا مطالعہ کرتے ہوئے ہر لمحے محسوس ہوتا ہے:

ع آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

توجہ کے طالب چند تخلیقی جملے دیکھیے:

”میری آنکھوں میں تمہاری آنکھیں آج بھی زندہ ہیں“

”کون سی دوسری شام۔۔۔؟اب تو ساری شامیں ایک سی ہیں۔سورج کا رنگ ہی نہیں بدلے گا اور نہ موسم ردا بدلیں گے۔شامیں تو اسی روز مرجھا گئی تھیں جس روز تم نے بستر کو گھر کیا۔“

ماضی کی بازیافت انسانی جبلت کا لازمہ ہے۔انسان اپنی یادوں سے کسی صورت دست بردار نہیں ہو سکتا۔گئے زمانوں کی خنک چھاؤں میں پناہ طلبی انسانی فطرت ہے۔

جوانی کی ریشمی صبحوں سے ادھیڑ عمری کی اداس شاموں تک سب کچھ انسانی حافظے میں محفوظ ہوتا ہے۔انسان بار بار اپنے ماضی کی طرف لوٹ جانا چاہتا ہے۔ناسٹلجیا (ماضی پرستی) انسانوں کی محفوظ پناہ گاہ ہے۔حال کے تلخ حقائق سے راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے خاکہ نگار بھی گاہے گاہے ماضی کی گود میں سر رکھ کر سو جاتا ہے۔

- ''کبھی کبھار کسی ایک کو چپکے سے بیری پر چڑھا دیتے۔اور باقی سب نیچے چادر پھیلا کر اس کے کونے پکڑ لیتے۔اونچے شہتیر پر پہنچ کر جیسے ہی ٹہنی کو جھنجھوڑا جاتا، تنی ہوئی چادر لال لال بیروں سے بھر جاتی۔مدرسے سے لوٹ کر یہ روز کا معمول تھا۔بیر چنتے ہوئے ہمیں اپنی سدھ بدھ نہ رہتی۔بھاگنا' شور کرنا' پاؤں میں چبھتے کانٹوں سے بے پروا بس بیر چنتے رہنا یہی زندگی تھی اور یہی جنت۔۔۔!''

تقلیب کی تکنیک تحریر میں دل آویزی تخلیق کرتی ہے۔تقلیب کا عمل رشتوں اور رابطوں کا عمل ہے جس میں ذہن ایک چیز سے دوسری چیز کی طرف یا دوسری سے تیسری چیز کی طرف منقلب ہوتا چلا جاتا ہے۔خاکہ نگار نے اس خاکے میں تقلیب کی تکنیک سے بھی استفادہ کیا ہے۔

- ''تم کانٹا اتنی نرمی' ملائمت اور آہستگی سے نکال لیا کرتی تھیں جیسے مکھن سے بال نکال لیا جائے۔

اور اب ماں۔۔۔

زندگی مسائل' دکھ اور پریشانیوں کے کانٹوں سے اٹی پڑی ہے۔

میری رُوح میں کانٹے پیوست ہیں۔

ان کانٹوں کو کون نکالے۔۔۔؟

کوئی سوئی۔۔۔؟

کہیں انگشتِ شہادت اور انگوٹھے کی چٹکی۔۔۔؟

ماں۔۔۔!

کوئی نہیں۔۔۔!

ہے۔ شور علیگ نے یہ شعر یقیناً ماں جی کے لیے لکھا تھا:

میرے حساس دل میں درد ہے سارے گلستاں کا

مجھے ہر شاخ شاخِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

ماں جی کی حساسیت اور احساسِ دردمندی سے لبریز یہ پیرا گراف:

''یہ بچے شور کیوں کر رہے ہیں اور خوشی کس بات کی منا رہے ہیں۔۔۔؟

ماں۔۔۔ پاکستان ایٹمی قوت بن گیا ہے۔

کیا پاکستان نے بھی ایٹمی دھماکے کر دیے۔۔۔؟

ماں ویسے ہی نہیں کر دیے۔ ہندوستان کے پوکھران کے دھماکوں کے جواب میں کیے ہیں۔

اچھا۔۔۔ ماں نے صرف اتنا کہا اور خلاؤں میں کھوگئی۔

چند گھنٹے ہی گزرے ہوں گے کہ مجھے بلایا اور کہا۔

بیٹا نواز شریف کو فون کرو اور کہو کہ اگر جنگ ہو تو ہندوستان پر ایٹم بم بالکل نہ پھینکے۔

ماں فکر نہ کرو۔ ہماری قیادت اتنی عاقبت نااندیش نہیں ہے۔

پھر بھی بیٹا' آنے والے وقت کے بارے کیا کہا جا سکتا ہے۔ امریکہ نے بھی تو ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم پھینک دیا تھا۔ اسے کوئی روک سکا تھا؟

ماں وہ امریکہ ہے۔

زیادہ باتیں نہ بناؤ اور نواز شریف کو فون کرو۔

رات میں ماں نے مجھے پھر بلا کر پوچھا۔

نواز شریف کو فون کر دیا ہے۔۔۔؟''

خاکہ نگار کی اپنی جذباتی اور ذہنی کیفیات ہوتی ہیں جو خاکے کے ہر لفظ اور ہر سطر سے عیاں ہیں ماں سے منسلک یادوں کا میوزیم کھلتا ہے تو خاکہ نگار انسان سے آنسو بنتا چلا جاتا ہے۔

تشبیب کے بعد گریز کا اپنا ہی ایک حسن ہے۔ شعری جمالیات کی یہ کیفیت غیر ارادی طور پر اس خاکے میں بھی کہیں کہیں دبے پاؤں در آئی ہے۔

- ''ماں۔۔۔ باہر گاڑی کھڑی ہے۔ بھائی محمود تیار ہیں۔ وہ گاڑی کی اگلی سیٹ کو وزن کے حساب سے ایڈجسٹ کر رہے ہیں۔ ہمارے خاندان میں ان کی ڈرائیونگ مسلّم ہے۔ بہت احتیاط اور مہارت سے گاڑی چلاتے ہیں۔ ان کا گاڑی چلانے کا تجربہ قریباً ایک لاکھ کلومیٹر سے اوپر ہو گیا ہے۔''

لفظوں کی مصوری، مرقع کشی اور جزئیات نگاری کے نہایت عمدہ نمونے اس خاکے کا خصوصی امتیاز ہیں۔ ایسے موقع پر خاکہ نگار کے باطن میں خوابیدہ افسانہ نگار بیدار ہوتا ہے۔

یہاں محمد حامد سراج کی قلمی کائنات کی ایک اور جہت کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ اس کے جہانِ نگارش کا نیا زاویہ یہ ہے کہ اس نے شعر و نثر کی سرحدیں مٹا دی ہیں۔ ابنِ انشا، امجد اسلام امجد اور سید مبارک شاہ کی نظمیں اس خاکے میں یوں جذب ہوتی چلی گئی ہیں جیسے خاکہ نگار نے یہ نظمیں خود تحریر کی ہوں۔۔۔ اس سے تحریر کی تاثیر میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے۔ محمد صلاح الدین پرویز نے بھی اپنے ناول ''دی وار جرنلس'' میں اس تکنیک کو کامیابی سے برتا ہے۔ اس ناول پر رائے زنی کرتے ہوئے معتبر نقاد اور ادیب ناصر عباس نیر نے اس تکنیک کی ان الفاظ میں حمایت کی ہے:

''دی وار جرنلس میں نظم و نثر کو یکجا کرنے کے ضمن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ جب ناول ایک نثری بیانیہ ہے تو اس ناول کے متن میں جگہ جگہ نظم کے پیوند لگانے کی کیا ضرورت اور کیا جواز ہے؟ کیا یہ کہہ کر اس سوال کو نمٹایا جا سکتا ہے کہ چوں کہ یہ جدید ناول ہے اور مابعد جدیدیت متن کی آزادانہ تشکیل کی داعی ہے اس لیے اگر خالص نثر سے بیانیہ میں نظمیہ ٹکڑے آ گئے ہیں تو اس میں اچنبھا اور حرج ہی کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ کوئی مناسب جواب نہیں ہے۔ دیکھنا چاہیے کہ ''دی وار جرنلس'' میں نظمیں کس مقام پر ظاہر ہوئی ہیں یا

"دی وار جرنلس" کی بیانیہ جہت کسی ایسی Space کو تحریک دیتی ہے جسے نظمیں پُر کر سکتی ہیں۔۔۔؟ اس کا جواب اثبات میں ہے۔ ایک حساس دل کے ردِ عمل کو بصورتِ نظم پیش کیا گیا ہے۔ یا پھر جہاں تخلیق کار شدید کرب سے گزرتا ہے، وہاں (کرب سے نجات کی خاطر) نظمیں آئی ہیں۔ گویا اس ناول میں نظمیں چیخ کی صورت ہیں یا آنسو کی صورت۔۔۔ احتجاج کی علامت ہیں یا گریہ کی، یوں نظمیں "دی وار جرنلس" کے بیانیہ میں رخنہ نہیں ڈالتیں اسے آگے بڑھاتی اور موضوع کی شدت کو اجاگر کرتی ہیں۔"

بعینہٖ اسی رائے کا اطلاق محمد حامد سراج کے لکھے اس خاکے پر بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس کی شدتِ گریہ جس نثری بیانیے میں جذب نہیں ہو سکی تو اس نے مذکور شعرا کی منظومات کا سہارا لیا ہے۔ یہ نظمیں ماں سے محروم ہر بیٹے کی آواز ہیں۔ ان نظموں کے آئینے میں ہر بیٹا اپنی مرحوم ماں کا سراپا دیکھ سکتا ہے۔

زیرِ نظر خاکے کے ضمن میں ہمیں اس رائے کا اظہار کرنے دیجیے کہ خاکہ نگار کی اس کاوش نے اس صنف کا مزاج، موسم، ماحول اور موڈ بدل کر رکھ دیا ہے۔ یہ تحریر درِ سماعت پر ہی نہیں درِ دل پر بھی دستک دیتی محسوس ہوتی ہے۔ اس خاکے کا قاری اسے اپنے وجود کی اندرونی تہوں میں اترتا محسوس کرتا ہے۔ "میّا" میں کہانی کا سحر بھی ہے اور رپوتاژ کا گہرا تاثر بھی۔۔۔! مرقع کشی کی نظر نوازی بھی ہے اور ڈرامے کی بیانیہ منظر نگاری بھی۔ بلاشبہ فقروں کی موزوں خشت کاری نے اسے ایک تخلیقی نثر پارہ بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر غفور شاہ قاسم

ایف سی یونیورسٹی لاہور

0333-6835093

میّا

صبح کا وقت تھا۔۔۔

ہم باورچی خانے میں ناشتہ کر رہے تھے۔ سورج کی کرنیں شیشم سے گزر کر مشرق سمت کی کھڑکیوں پر دستک دے رہی تھیں۔ ماں۔۔۔ تم نے باورچی خانے کی کھڑکی کی جالی پر دونوں ہاتھ رکھے اور اوک میں سے جھانکتے ہوئے کہا۔

بیٹا۔۔۔ میری بھوک مر گئی ہے۔

ماں۔۔۔

تمہاری پشت پر بوڑھا برگزیدہ شیشم رو رہا تھا۔

میں نے ساری مصروفیات ترک کیں اور تمہیں ہسپتال لے گیا۔

ڈاکٹر کی پیشانی پر ابھرتی متفکر لکیروں نے ساری کہی اور ان کہی باتیں بیان کر ڈالیں۔

بیماری کی تشخیص ہو گئی۔ تمہارے کمزور وجود پر یرقان کے حملے نے سارے گھر کو بے چین کر دیا۔

ماں۔۔۔

تمہاری آنکھوں میں زردی اتر آنے سے درختوں کے پتے زرد ہو گئے۔ یرقان کی پیلاہٹ تمہاری آنکھوں سے اتر کر پوری کائنات میں پھیل گئی۔۔۔ خوف اور وساوس کی چیونٹیاں میرے دل کی دیواروں پر رینگنے لگیں۔

یرقان لاعلاج تو نہیں؟

کون سا یرقان ہے۔۔۔؟

میری ماں کی بھوک کیوں مرگئی ہے۔۔۔؟

اچھا اچھا۔۔۔ یرقان میں بھوک مر جاتی ہے۔۔۔

طفل تسلیاں۔۔۔

واہموں نے مجھے چاروں اور گھیر لیا۔۔۔

بے بسی میری ہڈیوں میں اترنے لگی۔

علاج گھر پر ممکن نہیں تھا۔۔۔

ماں کو ہسپتال داخل کرا دیا۔

لیبارٹری رپورٹس آ گئیں۔

دیکھنا یہ تھا کہ کون سا یرقان ہے۔

سرجن نے کہاObstruction۔۔۔ ہےObsruction کہاں ہے؟۔۔۔

کیسے ہے؟ گال بلیڈر میںStone ہے یا۔۔۔؟

یا۔۔۔کیا۔۔۔؟

یہ 'کیا' درمیان میں کیوں آ گیا۔۔۔؟

سرجن مصطفی کاظمی نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا۔اس کے ہاتھ میں کافی کا مگ تھا۔دونوں ہاتھوں میں تھامے ہوئے مگ کو بغور دیکھتے ہوئے سرجن نے مجھے دیکھا۔

اور کہا۔۔۔

حامد صاحب!.Earth is not for living

میرے چہرے پر پسینے کی بوندیں اتر آئیں۔۔۔

ڈاکٹر صاحب میں سمجھا نہیں۔۔۔!

کافی کا مگ رکھ کر سرجن نے میز پر پیانو کی طرح انگلیاں بجاتے ہوئے کہا

حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔۔۔!

کیا کہنا مشکل ہے؟

سرجن کے دل میں کون سی بات ہے۔ وہ بات آئینے کی طرح شفاف کیوں نہیں کہتا۔

جی۔۔۔ڈاکٹر صاحب۔۔۔!

ہمیں شک ہے کہ کہیں Stone کے ساتھ Growth نہ ہو۔

میں نے امکان کے پہلو میں بیٹھے سر بہ زانو یقین کو دیکھ لیا۔

جب میں گھر لوٹ کر آیا۔۔۔تو گھر خالی تھا۔

ماں۔۔۔

ہسپتال میں تھی۔۔۔اور۔۔۔میں کہیں نہیں تھا۔

گھر میں۔۔۔باہر۔۔۔یا۔۔۔کسی اور جگہ۔۔۔!

گھر کے برآمدے میں کھڑے ہو کر میں نے ایک لمبی سانس لی۔

کمروں کی قطار۔۔۔شیشم کے درخت۔۔۔صحن میں دانہ دُنکا چگتی مرغیاں۔۔۔ اور مغربی کمرے کے اس دروازے کو دیکھا جہاں میری ماں اب بھی موجود تھی۔۔۔لیکن ماں تو ہسپتال میں ہے۔۔۔ماں کے بغیر پورا گھر بے ترتیب ہو گیا۔

ماں۔۔۔

سرجن نے C.T Scan کے لیے تمہیں اسلام آباد ریفر کر دیا۔

ایک موہوم سی امید۔۔۔

ایک ٹمٹماتا سا دیا۔۔۔

آس کی کچی ڈوری۔۔۔

ماں۔۔۔

اٹامک انرجی ہسپتال چشمہ سے جب تمہیں اسلام آباد ریفر کیا گیا تو تم نے کہا۔

بیٹا۔۔۔! ایک بار مجھے ہسپتال سے گھر ضرور لے جانا۔۔۔مجھے سب سے ملنا ہے۔ بزرگوں کے مزارات پر حاضری دینی ہے۔۔۔تمہیں گھر لے کر آئے۔ صحن میں رشتہ دار

تمہیں ملنے کو جمع تھے۔

تم نے وضو کیا۔۔۔

اور مزارات کو چل دیں۔

تم نے نفوس قدسیہ کے وسیلے سے اپنے رب کے حضور صحت کے لیے سندیسہ بھیجا۔ تم پلٹ کر گھر آئیں تو تمہارے چہرے پر اطمینان تھا۔ دروازے کے باہر گاڑی کھڑی تھی۔

صحن میں لگے فالسے کے درخت کے پاس سے تم گزریں۔ تمہاری پشت پر آباؤ اجداد کا متبرک کمرہ تھا۔

میں نے تمہارا چہرہ دیکھا۔

ماں۔۔۔!

میری آنکھوں میں تمہاری آنکھیں آج بھی زندہ ہیں۔

تمہاری آنکھوں میں وہ کیسی زردی تھی؟

اب تو سارے موسم زرد اور اداس ہیں۔

فالسے کے پاس سے گزر کر تم چارپائی پر آ بیٹھیں۔ سب سے معافی مانگی۔۔۔ ماں تم نے معافی کیوں مانگی؟ کیا تمہیں لوٹنا نہیں تھا۔۔۔؟ تم نے سب عورتوں کو گلے لگایا۔ بچوں کو پیار کیا اور پلٹ کر کہا:

"بیٹا۔۔۔! میرے سارے ادھار چکا دیے جائیں۔۔۔ جتنی امانتیں ہیں وہ فوری طور پر لوٹا دی جائیں۔"

ماں۔۔۔!

سفر کون سا طویل ہے۔ اسلام آباد تک ہی تو جانا ہے' پھر تم نے کیوں ادھار چکانے اور امانتیں لوٹانے کو کہا۔۔۔؟

میں سوچنے لگا کیا ماں کو سفر کی سمت معلوم ہے۔۔۔؟

لیکن ہمارا کیا ہوگا۔۔۔؟ ہم بے سمت زندگی کیسے گزاریں گے۔۔۔؟

ماں۔۔۔عید کی صبح۔۔۔جب ہمارے صحن میں پوری کائنات کی خوشیاں اتر آتی ہیں۔کئی سال سے روایت ہے۔قبلہ باباجی حضرت صاحب نمازِ فجر کے بعد ہمارے گھر تشریف لے آتے ہیں۔پوری خانقاہ ناشتہ ہمارے گھر پر کرتی اور عید مناتی ہے۔یہی ایک دن تو ہماری زندگی کا حاصل ہے۔ناشتہ کرنے کے بعد باباجی عیدی تقسیم کرتے ہیں۔صحن میں بہار کا سماں ہوتا ہے۔عیدی وصول کرتے ہوئے بچوں کے چہروں پر جو خوشی ہوتی ہے اسے کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔خوشی کا وہ منظر قابلِ دید ہوتا ہے۔

دس سال پہلے ابو اِس منظر سے چپ چاپ نکل گئے۔

اور اگلے سال۔۔۔؟

نہیں۔۔۔نہیں۔۔۔میں کچھ سوچنا نہیں چاہتا۔۔۔منظر ادھورے ہو گئے تو میں کہاں مکمل رہوں گا۔۔۔؟

عید کی صبح میں نے ہلکے سبز رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔

ماں۔۔۔

تم صحن میں کھڑی تھیں۔اچانک مغربی کمرے میں گئیں۔۔۔ٹرنک کھولا۔اس میں سے سبز میچنگ سویٹر نکالا اور مجھے پہنا دیا۔اور پھر اسی شام۔۔۔ہاں ماں۔۔۔اسی شام تم نے گہرے سبز رنگ کی جرسی پہنا دی۔

اور کہا۔۔۔یہ میرے بیٹے کو کتنی جچ رہی ہے۔

یہی نہیں۔۔۔عید کی اگلی صبح تم نے مجھے ایک اور سویٹر پہنا دیا۔

یہ ماں نے مجھے اتنی جرسیاں کیوں پہنا دی ہیں۔۔۔؟

ماں کو کس بات کی عجلت ہے۔۔۔؟

اسے کہاں جانا ہے۔۔۔؟

کیا اگلے برس عید کے منظروں میں ماں نہیں ہوگی۔۔۔؟

کیا آنے والی سردیاں ماں کے بغیر گزارنا ہوں گی۔۔۔؟

ماں نہیں ہو گی۔۔۔تو کیا یہ جرسیاں مجھے سرد موسموں کے عذاب سے بچا لیں گی۔۔۔؟

کیا جرسی ماں کی گود کا بدل ہو سکتی ہے۔۔۔؟

سفر خیریت سے گزر گیا۔تلہ گنگ سے چکوال کی طرف نکلے اور قریباً '۲۶' کلومیٹر بعد موٹر وے پر سفر مزید آرام دہ ہو گیا۔موٹر وے اسلام آباد سے لاہور کو جاتی ہے۔راستے میں مختلف Change Overs ہیں۔ہم میانوالی سے راول پنڈی اور اسلام آباد جانے کے لیے بلکسر کے Change Over سے موٹر وے پکڑتے ہیں۔اسلام آباد کی خنک صبح امی کو جب National Institute of Handicapped کے سامنے اتارا تو حمید قیصر وہیل چیئر لیے دروازے پر انتظار کر رہا تھا۔

امی گاڑی سے اتریں۔حمید قیصر کا سر چوما اور کہا۔۔۔"میرا بیٹا آیا کھڑا ہے۔"

وہیل چیئر پر ہماری کائنات تھی اور ہم تھے۔بھائی محمود' میمونہ اور شگفتہ۔

وساوس کا ایک شہر تھا۔۔۔اندیشوں' واہموں میں لپٹا اور سانس لینا محال تھا۔

(N.I.H) کی ڈاکٹر نور بی بی نے C.T Scan کے لیے دس بجے کا وقت دیا تھا۔

جب وہ پہنچی تو C.T Scan سے پہلے سات گلاس پانی پینے کو کہا۔

ماں۔۔۔تمہارے لیے ایک گلاس پانی پینا کارِ دارد تھا۔

یہ کیا۔۔۔نور بی بی نے سات گلاس پانی پینے کو کہا۔

کون پلائے گا سات گلاس پانی۔۔۔؟

امی جی کو میں پانی پلاؤں گا۔۔۔حمید قیصر نے جگ اور گلاس سنبھال لیا۔

دو گھنٹے میں سات گلاس پانی۔۔۔!

حمید قیصر نے پانی کے ساتھ ساتھ تاریخ سے لے کر ادب تک کے موضوعات تم سے چھیڑ دیئے۔

کرشن چندر' راجندر سنگھ بیدی' منٹو' قرۃ العین حیدر۔۔۔

کتنے ہی موضوعات تھے جن پر تم نے سیر حاصل گفتگو کر کے حمید قیصر کو حیران کر دیا۔

سات گلاس پانی۔۔۔؟

ہر پندرہ بیس منٹ بعد گلاس میں پانی انڈیل کر حمید قیصر کہتا۔

جی۔۔۔ امی جی۔۔۔ آپ کہہ رہی تھیں کہ کرشن چندر نے ساری عمر افسانے Parker Pen سے لکھے۔

پانی کے وقفوں کے دوران میں تم نے مجھے کہا۔

بیٹا۔۔۔ اگر ڈاکٹر آپریشن تجویز کریں تو مجھے لالہ شفیق کے گھر لے جانا۔ میں ان کے سوا اور کسی کے گھر قیام نہیں کروں گی۔

سات گلاس پانی۔۔۔!

ماں۔۔۔ جب تمہیں C.T Scan کے لیے لے جایا گیا تو تمہارے چہرے پر کتنا اطمینان اور سکون تھا۔

تم۔۔۔ C.T Scan Chair پر تھیں۔

اور دوسرے کمرے میں ڈاکٹر نور بی بی 'Computer Screen' پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔

بھائی محمود، میں اور حمید قیصر کاریڈور میں ٹہل رہے تھے۔

سینے کے پنجرے میں وساوس کا پنچھی سر پٹخ رہا ہو تو ٹہلنا بھی اک عذاب سے کم نہیں ہوتا۔

ہم ٹہلتے رہے۔۔۔

وقت سرکتا رہا۔۔۔

ماں۔۔۔ C.T Scan روم میں تھی۔

اتنے میں دروازہ چرچرایا۔۔۔

ادھ کھلے کواڑ میں سے نور بی بی کا چہرہ نمودار ہوا۔۔۔

وہ مرحلہ سامنے تھا جو سب سے مشکل تھا۔

حمید قیصر اور میں کیپٹل ہسپتال میں سرجن نوید اشفاق کے کمرے میں اس کا انتظار کھینچ رہے تھے۔

دھوپ کھڑکی کی جالی میں سے چھن کر اندر آ رہی تھی۔

سرجن نوید اشفاق دونوں کہنیاں میز پر ٹکائے اپنے ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ دھرے C.T Scan رپورٹ بغور دیکھ رہا تھا۔

حمید قیصر اور میں C.T Scan کم اور سرجن کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ زیادہ غور سے دیکھ رہے تھے۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔۔۔

جالی میں سے چھن کر اندر آتی دھوپ مر گئی۔

سورج بے نور ہو گیا۔

سرجن نے کرسی کی پشت پر سر ٹیک کر کہا:

آپ پڑھے لکھے ہیں۔ فن تخلیق کرتے ہیں۔ آپ سے کیا چھپانا۔

سرجن کا رخ اب میری طرف تھا۔۔۔

آپ کی والدہ کو کینسر ہے۔ جگر کا Tripple by pass operation ہوگا۔۔۔

کاغذ پر سکیچ بنا کر سرجن نے پوری تفصیل سمجھائی۔

سرجن بولتا رہا۔۔۔ سرِدست کچھ کہنا مشکل ہے۔ ویسے تو ہر آپریشن کے چانس ففٹی ففٹی ہوتے ہیں لیکن جگر کا بائی پاس۔۔۔؟

صرف دس فیصد امکانات ہیں' اگر Survive کر گئیں تو چھ مہینے نکال لیں گی اور آپ کو خدمت کا موقع مل جائے گا۔

میز پر کاغذ پڑا تھا۔

کاغذ پر سکیچ تھا۔۔۔

پنکھے کی ہوا سے لرزتا میرے دل کی طرح وہ کاغذ۔۔۔

جس پر سرجن نے ماں۔۔۔تمہارے جگر کو خون سپلائی بحال کرنے کے ممکنہ راستے مجھے سمجھائے۔کتنے گھنٹے۔۔۔؟ کتنے منٹ۔۔۔؟ آپریشن کب ہوگا۔۔۔؟ سرجن نے کیا کہا۔

لرزتا کاغذ کا ٹکڑا اور میرا دل۔۔۔

بچوں کی طرح حمید قیصر کے ساتھ کیپٹل ہسپتال کی سیڑھیاں' راہداریاں طے کرتا رہا۔

کون سا کمرہ۔۔۔؟

کس وارڈ میں۔۔۔؟

بیڈ کا نمبر۔۔۔نرسوں سے گفتگو۔۔۔ڈاکٹر انور زاہدی سے مشاورت۔۔۔!

حمید قیصر چلتا رہا۔۔۔اور میں اپنے آپ کو گھسیٹتا رہا۔۔۔

Officers Ward .... Room No. 21

وہی جگہ' وہی کمرہ۔۔۔جہاں چند روز پہلے حمید قیصر کی اہلیہ کا آپریشن ہوا اور اِکیس پتھریاں برآمد ہوئیں۔سعدیہ نے کہا۔۔۔!

انکل۔۔۔یہ جار دیکھ رہے ہیں نا۔۔۔اکیس پتھریاں۔۔۔ہماری امی نے کیسے کیسے دکھ پال رکھے تھے۔

اسلام آباد کی وہ شام کتنی اداس اور بے کیف تھی۔

ماں۔۔۔

بلیو ایریا کی بلند قامت عمارتوں کے درمیاں ایک TEST LAB. میں دوبارہ الٹرا ساؤنڈ کا عمل دُہرایا گیا۔

ایک سائمل۔۔۔Blood---Urine Test---

L.F.T کا گراف۔۔۔؟

⁂

ہسپتال کی سیڑھیاں طے کر کے کمرہ نمبر اکیس میں جانے تک کی مسافت طے کرنے میں مجھے زمانے لگے۔ میرے پورے بدن میں ایک انمٹ تھکاوٹ اترتی چلی جا رہی تھی۔

حمید قیصر نے تمام انتظامات مکمل کیے۔

شام اتر رہی تھی۔

پائن کے بلند و بالا بوڑھے درخت چپ کھڑے تھے۔

ہسپتال کی جنوبی سمت میں واقع مسجد میں نمازی قطار اندر قطار جا رہے تھے۔

ہم بھی اسی قطار میں تھے۔

کمرہ نمبر اکیس کی جنوبی کھڑکی مسجد کی سمت کھلتی تھی۔

مسجد کے بیرونی دروازے پر ''ختمِ نبوت کانفرنس'' کا قدِ آدم اشتہار آویزاں تھا۔

صدارت جلی حروف میں امیرِ مرکزیہ مجلس تحفظِ ختمِ نبوت حضرت مولانا خان محمد کی تھی۔ اشتہار میں اس نام سے بزرگی اور زندگی کی علامت نمایاں تھی۔

ماں۔۔۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اٹھ کر یہ نام دیکھ لیتی اور اطمینان کا سانس لیتی۔

ماں۔۔۔

تمہارے ماموں کا نام۔۔۔

سلسلۂ نقشبندیہ کے مقدس سلسلے کے تسلسل کا نام۔۔۔

تمہیں یقین ہو گیا کہ باباجی یہیں موجود ہیں۔۔۔ آس پاس۔۔۔!

تمہاری تسلی کا ساماں کرتے ہوئے۔

مغربی سمت خانقاہ سراجیہ کے ریلوے اسٹیشن کے پاس۔

اور۔۔۔تاحدِ نظر سر ہی سر تھے۔

اور پوری فضا مشک بار۔۔۔!

میں نے ایک شخص کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

بھائی۔۔۔یہ کس کا سفرِ آخرت ہے۔۔۔؟

محمد حامد سراج کی والدہ۔۔۔!

اور یہ فضا کیوں مشک بو ہے۔

فضا کیوں مشک بو نہ ہو۔ ساری عمر درود کی کثرت رہے تو زمانے عطر آگیں ہو جاتے ہیں۔

صبح دم میں نے خواب تمہیں سنایا۔۔۔

اس وقت صحن میں بچھے تخت پوش پر رحل میں رکھی درود شریف کی کتاب میں رحمتوں کی بارش تھی اور تم تھیں۔ تمہارے سامنے محمد بن سلیمان جزولیؒ کی دلائل الخیرات رکھی تھی۔

وہی محمد بن سلیمان جزولیؒ۔۔۔!

جو ایک بار شہرِ فارس کے ایک گاؤں میں وارد ہوئے۔

نمازِ ظہر کا اخیر وقت ہو چکا تھا۔

اور پانی موجود نہ تھا۔

تلاش و جستجو کے بعد ایک کنواں نظر آیا لیکن ڈول اور رسّی نہ تھی۔ شیخ موصوف کنویں کے چاروں طرف چکر لگاتے اور پریشان پھرتے لیکن اس دشواری کا کوئی حل نظر نہ آتا۔

اتفاقاً سامنے کے ایک مکان سے آٹھ یا نو سالہ ایک لڑکی بھی یہ ماجرا دیکھ رہی تھی۔

اس نے شیخؒ سے پوچھا:

اے شیخ تری پریشانی کا سبب کیا ہے؟

انہوں نے کہا۔۔۔ میں محمد بن سلیمان جزولی ہوں۔ظہر کا وقت تنگ ہو چکا ہے۔ پانی کا کوئی ذریعہ نہیں اس لیے پریشان ہوں۔

لڑکی نے جواب دیا۔

تم اتنی مشہور ہستی ہو اور ایک معمولی سا کام بھی انجام نہیں دے سکتے۔اور یہ کہہ کر لڑکی باہر آئی اور جا کر کنویں میں تھوک دیا۔اس کے تھوکتے ہی کنواں جوش مارنے لگا اور پانی باہر بہنا شروع ہو گیا۔

سب لوگوں نے وضو کیا اور نماز سے فراغت پائی۔

شیخ نماز سے فارغ ہونے کے بعد اس لڑکی کے مکان پر گئے اور دستک دی۔جب لڑکی باہر آئی تو شیخ نے اس سے فرمایا۔

تمہیں اللہ کی قسم جس نے تم کو پیدا کیا اور سیدھا رستہ دکھایا۔میں تم کو اللہ اور اس کے تمام رسولوں اور خاتم النبیین ﷺ کا واسطہ دیتا ہوں جن کی شفاعت کی تم امیدوار ہو۔

اللہ کے لیے یہ تو بتا دو کہ تم اس مرتبہ کو کس طرح پہنچیں۔۔۔

اس نے جواب دیا۔

اگر تم مجھے اتنی بڑی قسم اور اتنا بڑا واسطہ نہ دلاتے تو میں ہرگز نہ بتاتی۔

دراصل مجھے یہ مرتبہ ایک درود کے پڑھنے سے حاصل ہوا ہے جس کا میں ہمیشہ ورد کرتی ہوں۔

شیخ نے اس لڑکی سے وہ درود سیکھا اور اس کی اجازت حاصل کی۔اس اجازت کے بعد شیخ کے دل میں خیال آیا،شوق پیدا ہوا کہ ایک ایسی کتاب تحریر میں لائی جائے جس میں تمام بہترین درود جمع ہوں اور وہ اس درود کے الفاظ پر بھی مشتمل ہو جو لڑکی سے حاصل کیا تھا۔

***

ہسپتال کی جنوبی سمت کی مسجد میں نمازی قطار اندر قطار جا رہے تھے۔

ہم بھی اسی قطار میں تھے۔

اور باہر بوڑھے پائن کے درخت قطار میں چپ کھڑے تھے۔

نماز کے بعد آسمان پر تارے ایک ایک کر کے جاگ اٹھے۔

ہسپتال کے سامنے بیمار اور زرد کوارٹروں کی ایک لمبی قطار تھی۔ ان کوارٹروں میں گزشتہ برسوں میں جانے کتنے مکین بدل چکے تھے۔

انہی کوارٹروں میں سے ایک کوارٹر کی کھڑکی کھلی تھی۔

زرد چہرے والا ایک بوڑھا شخص اس میں رزق کا سامان لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے سر پر بال نہیں تھے۔ چہرے پر جھریاں مکین تھیں۔ اسے شاید خود بھی اپنی عمر اور جھریوں کا اندازہ نہیں تھا۔

مختصر سا جنرل سٹور۔۔۔ کریانے کا سامان۔۔۔ اور اسی میں ہوٹل بھی۔۔۔!

یہ غالباً گھر کی بیٹھک تھی جسے سٹور میں بدل دیا گیا تھا۔

ایک کھڑکی اندر گھر میں کھلتی تھی جس میں سے مستورات ایک تھرموس میں اسے چائے پکڑا دیتیں اور یوں گاہک کو آسانی رہتی۔ اسے استعمال کی اشیاء با آسانی میسر آ جاتیں۔

کھلی کھڑکی میں سے چائے آئی۔

مجھے یوں لگا۔۔۔

میری ساری زندگی اسی کھڑکی، ہسپتال، پائن کے بوڑھے درختوں اور پیچ در پیچ گلیوں

چچا وکیل اور چچا شفیق۔۔۔

سب موجود تھے۔۔۔

وہ دوست بھی جن کے سر پر ہاتھ پھیر کر تم نے دعائیں ان کے نام کیں۔۔۔

محمد حمید شاہد، حمید قیصر، علی محمد فرشی، ارشد چہال، سلطان ختک، اصغر عابد، خلیل جازم، قیس علی، ڈاکٹر انور زاہدی۔۔۔!

سب موجود تھے۔۔۔

میں اکیلا نہیں تھا۔ ربِ کریم نے میری دل جوئی کو میلہ لگا دیا تھا۔

***

ماں۔۔۔

جب تمہیں آپریشن کا لباس پہنا کر آپریشن روم لے جایا جا رہا تھا۔

میں تمہیں دیکھ رہا تھا۔

میں تمہیں روک لینا چاہتا تھا۔

میں نے ان کاغذات پر آپریشن کے لیے اپنے دستخط کیوں ثبت کیے جو میرے سامنے رکھے تھے۔۔۔؟

میری بینائی کیسے سلامت رہی۔۔۔؟

اس روز ایک ہی وقت میں بہت سے آپریشن تھے۔

سٹریچروں پر لیٹے ایک سے لباس میں ملبوس مریض۔۔۔

میں نے آخری بار دروازے میں جڑے شیشے میں سے اندر کا منظر دیکھنے کی ناکام کوشش کی۔تم نظر سے اوجھل ہو چکی تھیں۔۔۔

سارے منظر دُھندلا گئے۔

اور وہی دُھندلے منظر آنکھ کے آئینوں میں جھلکتے رہتے ہیں۔

حمید قیصر تمہارے ساتھ ہی اندر آپریشن روم میں چلا گیا۔جانے اسے کیسے اجازت مِل گئی۔۔۔؟

گیلری میں ہم سب تھے۔

سیڑھیوں پر بشارت احمد، سلطان ختک اور احمد خلیل جازم

باہر لان میں بھی متفکر چہرے تھے۔

ہونٹوں پر دعاؤں کے دیپ جلائے' انتظار کی ردا اوڑھے

وقت کیسے گزرا۔۔۔؟

مجھے نہیں معلوم

ماں۔۔۔

تمہارے بعد وقت کے پیمانے میری مُٹھی سے پھسل گئے۔

کسی نے خبر دی آپریشن مکمل ہو گیا۔

کیسے۔۔۔؟

مجھے نہیں معلوم۔۔۔؟

آپریشن روم سے جب تم کو کمرے میں لایا گیا، اس لمحے خلیل جازم نے مجھے اندر کمرے میں نہیں جانے دیا۔ اس نے مجھے روک لیا۔

تھام لیا۔۔۔

دلاسہ دیا، ایک صوفے پر بٹھایا اور پانی کا گلاس پلایا۔۔

پانی کے سات گلاس تھے جو حمید قیصر نے امی کو پلائے تھے اور اب ایک گلاس خلیل جازم کے ہاتھ میں تھا۔۔۔ ایک گھونٹ بھی حلق سے اُترنا مشکل تھا۔

میں اس کمرے میں کیسے داخل ہوا۔۔۔؟

تم سامنے بستر پر تھیں اور تمہارے پورے بدن میں پلاسٹک کی نالیاں رستہ بناتی تھیں۔ ناک میں دو نالیاں جن میں سبز رطوبت تیرتی تھی۔

پہلو میں سے رستہ بناتی ایک پلاسٹک کی نالی جس سے لہو رِستا تھا۔

اور قطرہ قطرہ میرے اندر گرتا تھا۔

میری ناک میں لگی پلاسٹک کی نالی سے رطوبت رستی تھی۔

یہ سرجن نے کیا کر دیا۔

میرے بدن کو کیوں۔۔۔؟

ماں کو کب ہوش آئے گا؟

سرجن تمہیں دیکھ کر پلٹنے لگا تو جاتے جاتے رک گیا۔

میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔۔۔

میں اندر سے لرز رہا تھا۔

میں نے آپریشن کر دیا ہے۔ کینسر بہت پھیل گیا ہے۔ میں نے اسے بیاپسی ٹیسٹ کے لیے بھی Touch نہیں کیا۔ امید ہے ماں جی چھے ماہ' سال کھینچ لیں گی۔ آپ کو خدمت کا موقع مل جائے گا۔

ابھی۔۔۔

سرجن سیڑھیاں پوری نہیں اترا تھا کہ پلٹ کر ڈیوٹی ڈاکٹر پر برس پڑا۔

تم انسان ہو۔۔۔؟ تمہاری کھوپڑی میں عقل ہے کہ نہیں۔۔۔؟ سرجن کی آواز کوریڈور میں گونج رہی تھی۔۔۔ اور چھے سوا چھے فٹ کا دراز قد ڈاکٹر ہاتھ میں چھٹی کی درخواست پکڑے سرجن کے سامنے کھڑا کانپ رہا تھا۔

سرجن کی آواز گونج رہی تھی۔

یہ میں نے جو Tripple By Pass آپریشن کیا ہے یہ مذاق نہیں ہے اور تم۔۔۔ بے حس انسان چھٹی مانگ رہے ہو۔ تمہیں یہاں موجود رہنا ہے۔ انسانی زندگی سے زیادہ قیمتی اور کوئی چیز نہیں ہے۔ اپنے احساس کو زندہ رکھو۔

سر۔۔۔ سر۔۔۔ وہ۔۔۔ میرے ایک دوست کی شادی ہے۔

شادی ہے۔۔۔؟ سرجن نے زہر خند لہجے میں کہا۔

شادی میں شرکت ضروری ہے یا انسانی جان بچانا۔۔۔؟ مجھے بھی لاہور ایک شادی میں شرکت کے لیے جانا تھا۔ صرف اسی آپریشن کی وجہ سے میں نے لاہور کا سفر ملتوی کر دیا ہے۔

سرجن نے غصے میں درخواست ایک طرف سرکائی اور ڈیوٹی پر موجود نرس سے کہا۔

مریضہ کو یہاں اپنی Sitting place کے سامنے والے کمرے میں لے آؤ اور ایوننگ اور نائٹ شفٹ کی سسٹرز کو سختی سے ہدایت دو کہ رات میں سونا نہیں ہے۔ میں آن لائن ہوں۔ اس نے اپنا موبائل نمبر دیتے ہوئے کہا۔

جیسے ہی کوئی ابنارملٹی محسوس ہو مجھے فوری اطلاع کرنا ہے۔

سرجن سیڑھیاں اُتر گیا۔۔۔

ماں تم کمرے میں تھیں

اور میرے پہلو میں لگی پلاسٹک کی نالی سے لہو رستا تھا۔

باہر پائن کے درختوں میں اداس ہوا سرسراتی تھی۔

***

ماں۔۔۔

گھر سے آئے تمام افراد کے چہروں پر سوالات کے خیمے تنے تھے۔

وہ متفکر تھے کہ جب آپریشن خیریت سے ہوگیا ہے تو یہ فضا میں حبس کس طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ ہمارے پاس ان کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس بے اعتبار زندگی میں کتنے ہی سوالات ادھورے رہ جاتے ہیں۔ ان کا جواب کہیں بھی نہیں ہوتا۔ بس وہ سوال ہی رہتے ہیں۔ چبھتے، نوکیلے اور کٹیلے سوال!

ہمارے پاس بھی ہماری ادھوری اور کٹی پھٹی زندگی کا کوئی جواب نہیں تھا۔

ماں۔۔۔ تمہارے آپریشن کے بعد میرے وجود کا کوئی بھی حصہ سلامت نہیں رہا، مجھے نسیان نے آلیا ہے۔ میں راستے اور باتیں بھولنے لگا ہوں۔ گھر سے سودا سلف لینے نکلوں تو بازار کی بجائے ویرانے میں جا نکلتا ہوں۔

تمہارے بعد ویرانے ہی مسکن ہو گئے۔

سوالات کے خیمے تنے تھے اور میں اکیلا تھا۔

میرے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں کہ جب سب موجود تھے تو میں اکیلا کیوں تھا۔۔۔؟

اور اسی اکیلے پن کے بنجر صحرا میں اکیلا کھڑا تھا کہ کسی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔

لالہ عزیز تھا۔

اس کا ہاتھ میرے کندھے پر مرہم ہو گیا۔

مجھے ساتھ لے کر لالہ عزیز ہسپتال کی کینٹین کی سیڑھیاں اُترنے لگا۔ کینٹین Basement میں تھی۔ ہم پلاسٹک کی کرسیوں پر بیٹھے تھے اور خاموشی تھی۔ آوازیں معدوم تھیں یا مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

لالہ عزیز نے چائے کا کہا اور میرے اندر کی خاموشی میں ایک کنکر پھینکا۔

بات کیا ہے۔۔۔؟

لالہ جی کچھ نہیں

اتنی خاموشی۔۔۔؟

میرے اندر سمندر اُتر آئے اور میرا غم آنکھ کے جزیروں میں آ بیٹھا۔

لالہ عزیز کا ہاتھ میرے ہاتھ کی پشت پر دھرا تھا۔

میری زبان میں لکنت اُتر آئی۔۔۔

لالہ جی۔۔۔ امی کو کینسر ہے

چائے کی پیالیاں چھلک گئیں۔ کرسیاں اوندھی ہو گئیں۔ کینٹین میں موجود تمام لوگ بے روح ہو گئے۔

میں تھا۔۔۔ لالہ عزیز اور درد کا لامتناہی صحرا۔۔۔!

بہت ہوتے ہیں۔۔۔ چھ ماہ بہت ہوتے ہیں۔۔۔ کیا خبر ہم آپا جی سے پہلے لوٹ جائیں۔ تم لوٹ جاؤ' میں لوٹ جاؤں۔۔۔ ہمت کرنا ہے۔۔۔ لالہ عزیز تسلی دے رہا تھا۔

کینٹین سے باہر نکلے تو وہی بے سمت درد کی ہوا تھی۔

لالہ عزیز تھا۔

اور۔۔۔ مرہم تھا۔

ہر دکھ میں میرے لیے سائباں ہو جانے والا۔۔۔ لالہ عزیز۔۔۔!

ماں۔۔۔

یہ جو لالہ عزیز ہے نا۔ یہ بوڑھا برگد ہے۔شاید یہ وہی ہے جو بدھا تھا۔اس نے روشنی کا نروان کہاں سے حاصل کیا ہے۔۔۔؟

دکھ کے لمحات میں یہ میرا ایسا ساتھی ہے جس کا کوئی بدل نہیں

یہ اس صبح بھی موجود تھا جب ابو نے رختِ سفر باندھا۔

****

ماں۔۔۔

ابو کے حادثے کے زخم میرے اندر تر و تازہ ہیں۔

وہ صبح کتنی اندوہناک تھی جب ابو اپنے ایک کام کے سلسلے میں گھر سے سرگودھا کی جانب جوہر آباد کے لیے نکلے۔ سفر اتنا تو نہیں تھا۔۔۔ جوہر آباد تک ہی تو جانا تھا۔

ابو جوہر آباد کی بجائے عدم آباد کو نکل گئے۔

وہ تو کار بہت محتاط انداز میں چلاتے تھے۔ کراسنگ کے دوران میں پوری سڑک چھوڑ دینا ان کا معمول تھا۔

یہ کیا ہوا۔۔۔؟

سرگودھا سے قائد آباد آنے والی ویگن ان کی تاک میں کیوں تھی۔۔۔؟

خبر آنے پر گھر میں کہرام مچ گیا۔

بے چینی' خوف' وسوسے' اندیشے۔۔۔

قائد آباد سے ملتان نشتر ہسپتال تک کا سفر کتنا جان لیوا تھا۔

رات کے کسی پہر میں ہم وہاں پہنچے تھے۔

مجھے اتنا یاد ہے۔۔۔ ڈیوٹی ڈاکٹر نے کہا تھا۔ یہ شاک میں چلے گئے ہیں۔

ابو کی ایک ٹانگ مکمل کچلی گئی' دوسری میں فریکچر بے شمار تھے۔

اندرونی چوٹوں کا تو شمار ہی نہیں تھا۔

قائد آباد سے ملتان تک کے ساڑھے تین سو کلومیٹر کے سفر میں خون قطرہ قطرہ بہہ گیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رٰجِعُوْن۔

کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ۔

میرے اللہ نے سچ کہا۔

ابو نے سفر مکمل کر لیا اور ابھی ہم سفر میں تھے۔

نشتر ہسپتال کی پرشکوہ عمارت لرزنے لگی۔

راہداریوں کا سفر کیسے طے ہوا؟

ماں۔۔۔

کچھ یاد نہیں۔

تم ہمیں سنبھالنے کو موجود تھیں۔ سارے دکھ تم نے اپنے آنچل میں چھپا لیے۔

ماں۔۔۔

میں اس بات کا اظہار کیسے کروں۔ اندر کے اس دکھ کو زبان کیسے دوں۔۔۔؟ کہ جب انسان کے اندر کسی کی موت کا بیج اگنے لگے تو کیا کیفیت ہوتی ہے۔ یہ پودا روح کی زمین کا سینہ چیر کر کیسے باہر کو نکلتا ہے۔ اور پھر اس پر لہو کی بوندوں سے کیسے پھول کھلتے ہیں۔

ابو کا سفرِ آخرت۔۔۔؟ یہ تحریر کیسے مکمل کروں میں۔۔۔!

کئی ماہ تلک قلم وقت کے صحرا میں سیاہی کی بوند کو ترستا رہا ہے۔ ماں میں یہ تحریر روشنائی کی بجائے اپنے آنسوؤں سے لکھ لیتا لیکن میری آنکھ کی دوات میں رکھی روشنائی بے رنگ ہو گئی ہے۔ بے رنگ اشکوں میں، میں رنگ کیسے بھروں۔۔۔؟

***

ماں۔۔۔

میں لالہ عزیز کے ساتھ جب کینٹین سے باہر نکلا تو پھر بے سمت دکھ کی ہوا تھی۔ شام تلک گاؤں سے آئے سارے احباب لوٹ گئے۔ ربِ کریم سب کو آباد رکھے۔ کتنی مشکل اٹھائی۔ سفر کی صعوبت اٹھا کر آئے۔ ماموں سلیم رکے رہے۔

وہ واپس لوٹنا چاہتے بھی تو ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔

تمہارا حکم وہ کیسے ٹال سکتے تھے۔

تم نے ماموں سے کہا:

سلیم۔۔۔ مجھے ایک نیا کمبل خرید کر لا دو، مجھے ہسپتال کے کمبلوں سے گھن آتی ہے۔

ماموں اُسی وقت سپر مارکیٹ گئے اور تمہارے لیے کمبل خرید لائے۔۔۔

ماں۔۔۔

تمہارا اگلا حکم ان کے نام یہ تھا کہ جب تک میں نہ کہوں تم نے کوئٹہ ڈیوٹی پر ابھی نہیں جانا۔

پائن کے درختوں کے درمیان ماموں میرے ساتھ بہت دیر دُکھ بانٹتے رہے۔

ان کی عینک کے دبیز شیشوں کے پیچھے آنسوؤں کے قافلے رواں تھے۔

مغرب کی نماز ادا کی۔ مسجد سے نکلا۔ پاؤں میں چپل اڑستے ہوئے اپنے سامنے ایستادہ کیپٹیل ہسپتال کی اس کھڑکی پر نگاہ جم گئی اور میرے قدم رک گئے۔ کمرے کی بتی بند تھی۔ شاید تم نیند میں تھیں اور کسی نے بتی بجھا دی تھی۔

لیکن تم کمرے میں موجود تو ہو۔

پھر یہ اشک تھم کیوں نہیں جاتے۔۔۔

میں اندر سے خالی ہو رہا ہوں۔

نماز ادا کرتے ہوئے' اُنگلیوں پر تسبیحات شمار کرتے ہوئے' میں نماز کی رکعتوں اور تسبیح کے شمار کی تعداد بھول جاتا ہوں۔ سجدہ سہو ادا کرتا ہوں لیکن یہ بھول جاتا ہوں کہ سجدہ سہو میں دو سجدے مکمل کر لیے یا ایک ہی سجدہ کیا ہے۔۔۔؟

میرے اندر موت رینگ رہی ہے۔

ماں تم ہسپتال میں کتنے سال رہو گی۔۔۔؟ یہ وقت کی رفتار کو کیا ہو گیا ہے' مجھے ایسا کیوں محسوس ہو رہا ہے کہ میں قرن ہا قرن سے اس ہسپتال اور مسجد کے درمیان مقیم ہوں۔

میں نے اپنے داہنے ہاتھ اداس کھڑے درخت سے پوچھا۔

تم کتنے سال سے اس ہسپتال کی عمارت میں موت اور زندگی کا کھیل دیکھ رہے ہو۔

درخت بولتا کیوں نہیں۔۔۔؟ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں نماز سے پہلے کون سا کام کرنا تھا مجھے۔ شاید فون کرنا تھا' لیکن کہاں۔۔۔؟

ایک فون ہی تو کرنا ہے' لیکن یہ فون کون کرے۔ بے جان تاروں پر کرلاتی آواز کویت تک کون پہنچائے۔۔۔؟ کون چچا جان اور خالہ امی کو اطلاع کرے؟

ماں۔۔۔ حوصلہ کس بازار میں بکتا ہے۔

کوئی تو چٹکی بھر ہم کو بھی خرید کر لا دے۔ ہم کو ایک فون کرنا ہے۔

کیسے کہا جائے؟ وہ دل وہ زباں کہاں سے لائی جائے' جو یہ کہے "ماں کو کینسر ہے۔"

یہ لفظ سماعت سے کئی بار ٹکرایا تھا۔ کہانیوں اور افسانوں میں پڑھا تھا۔ کالج کی زندگی میں جو فلمیں دیکھی تھیں ان میں بھی یہ منظر تھا۔

بس پردہ سکرین پر دیکھا۔ کہانی اور افسانے میں پڑھا اور بھول گئے۔

لیکن آج پورا وجود اسی آگ میں جل رہا ہے۔ یہ تپش بدن تک ٹھہری رہتی تو بات اور تھی۔ اس نے روح اور دل کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

ماں۔۔۔روح کی سلگن کیا ہوتی ہے۔روح سلگتی ہے اور دھواں بھی نہیں اُٹھتا۔
یہ اس وقت سلگتی ہے جب ماں کی دائمی جدائی میں چھ مہینے باقی ہوں۔ایک سواتی دن۔۔۔!

ماں۔یہ شمار کس نے ایجاد کیا تھا؟
اسے معلوم نہیں تھا گنتی کا عذاب کتنا جان لیوا ہوتا ہے؟
یہ ایک دن میں چوبیس گھنٹے ہی کیوں۔۔۔؟
ماں بولو۔۔۔نا۔۔۔اگر چوبیس سال کا ایک دن ہوتا تو پھر تم بہت سال ہمارا سائبان رہتیں لیکن ہمارے سوچنے سے پیمانے کہاں بدلتے ہیں۔
ایک فون ہی تو کرنا ہے۔
تین منٹ کی کال۔۔۔ایک سواتی سیکنڈ اور ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ ماں تمہاری زندگی کے ایام کا شمار بھی کم وبیش یہی ہے کوئی ایک سواتی دن۔۔۔!
ماں ڈاکٹر نے یہ کیوں کہا۔جھوٹ بول لیتا۔کسی کا دل رکھنے کو تو جھوٹ بولنا جائز ہے۔
اسماء نے کویت فون کر دیا۔ء
موت ایک اٹل حقیقت ہے۔
كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْت۔
لیکن ایک سواتی دن پہلے ہی یہ خبر کیوں۔۔۔؟
موت سے پہلے مرجانا کسے کہتے ہیں۔کوئی ہم سے پوچھے۔۔۔؟
تو کیا کویت سے خالہ امی اور چچا جان کے آجانے سے یہ وقت ٹل جائے گا۔
موت کنی کترا کر گزر جائے گی۔
فاصلے کتنے سمٹ گئے ہیں۔ہزاروں میل کی مسافت چند گھنٹوں میں طے کر کے خالہ امی کویت سے کیپٹل ہسپتال پہنچ گئی ہیں۔ان کے دل کے صندوق میں ہزاروں لاکھوں وساوس بند ہیں۔وہ جب تمہارے کمرے میں داخل ہوئیں تو ان کی آنکھوں کی دہلیز پر

رکھے آنسو رونے لگے۔

لیکن ان کا چہرہ دیکھ کر تمہارے اندر امید کی قندیل جل اٹھی۔

تمہارے چہرے پر اطمینان اتر آیا۔ تمہارا اطمینان ہمارا اطمینان ٹھہرا اور کچھ دیر کو ہم بھی پرسکون ہو گئے۔

دوسری شام۔۔۔

کون سی دوسری شام۔۔۔؟ اب تو ساری شامیں ایک سی ہیں۔ سورج کا رنگ ہی نہیں بدلے گا اور نہ موسم رِدا بدلیں گے۔ شامیں تو اسی روز مرجھا گئی تھیں جس روز تم نے بستر کو گھر کیا۔

دوسری شام۔

ماں تم نے تکیے کا سہارا لیا ہوا تھا۔

پلاسٹک کی نالیاں ابھی تمہارے جسم میں مکین تھیں۔ ناک کے راستے ڈالی گئی اور پہلو کا گوشت کاٹ کر نکالی گئی نالی سے عجیب رنگ کا مواد نکل رہا تھا اور ایک تمہارا حوصلہ اور صبر تھا اور برداشت کی حد۔۔۔!

جس کا ذکر پورے ہسپتال میں ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر کے ذہن سے لے کر نرسوں کی گفتگو تک۔

بیٹا۔۔۔ خالہ امی نے مجھے آواز دی۔

جی!

انہوں نے مجھے اشارے سے کمرے سے باہر بلایا۔

دوسری منزل کی مشرقی سمت کھلنے والی گیلری کے اختتام پر لگی کھڑکی کے ساتھ ٹیک لگائے میں خالہ امی کے سامنے کھڑا تھا۔

بیٹا۔۔۔ ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں۔۔۔؟

دو آنسو میری آنکھوں سے نکل کر شام کے دھندلکے میں گم ہو گئے۔

مجھے نہیں رونا چاہئے۔ ابھی تو ماں زندہ ہے۔ موجود ہے۔

خواہش ہوتی ہے کہ اس کا کوئی قول و فعل کسی کے نام دکھ نہ لکھے۔

کسی سے معاملات میں اُلجھا نہ جائے۔

نفرت، غصہ، کینہ اور بغض کو دل سے نکال پھینکا جائے۔

بس ملنساری کا لباس پہن کر زندگی گزاری جائے۔

ماں۔۔۔

کہا ہے۔۔۔نا۔ تمہارے بعد یہ زندگی بے ترتیب ہوگئی ہے۔ ریزہ ریزہ زندگی کو کیسے ترتیب دیا جائے۔ آنسوؤں کو کس تاگے میں پرویا جائے۔

ماں۔۔۔

دوستی سنبھالنا اور اسے پالنا بھی تو مجھے ماں تمہی نے سکھایا تھا۔ میرا ہر دوست تمہارا بیٹا تھا۔ اسے تم نے پیار دیا۔ توجہ دی، اس پر اپنائیت نچھاور کی۔

ماں تیس برس پہلے کی بات ہے۔

ہاں ماں۔۔۔ لگ بھگ اتنے ہی سال گزرے ہوں گے۔

لیکن یہ تو کل کی بات لگتی ہے۔ بات کل کی کیوں نہ ہو۔ یادیں بھی کبھی گرد آلود ہوتی ہیں۔

میں میٹرک میں تھا۔ لا اُبالی اور جذباتی۔ دوستی کے معاملات میں حساس اور زود رنج۔ دوست ہی میرا سرمایہ زیست، میری کائنات۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جن دنوں میں گورنمنٹ ہائی سکول میانوالی کا متعلم تھا۔ میں تعلیم کے مراحل سے گزر رہا تھا۔ رہائش ننھیال میں تھی۔ ان دنوں ''آداب عرض'' اور ''عوامی ڈائجسٹ'' کا بڑا چرچا تھا۔ نانا جان بھی ان کے قاری تھے۔ ان دونوں جرائد میں محمد یار عاصی کی کہانیاں چھپا کرتی تھیں۔ ان کی رہائش گرڈ اسٹیشن کی کالونی میں تھی۔ وہ واپڈا میں لائن سپرنٹنڈنٹ تھے۔ ان کے ساتھ اسی دور میں ادبی تعلق استوار ہوا۔۔۔ میں چھٹی کا دن اکثر ان کے ہاں گزارتا۔ کیا وضع دار اور خوبصورت لوگ تھے۔ چھوٹا سا کوارٹر برآمدے میں رکھا لوہے کا چولہا، صحن میں خشک لکڑیوں کا انبار اور صحن میں لگی لوہے کی تار

پر سوکھتے کپڑے۔۔۔!

کون کہتا ہے تیس سال گزر گئے ہیں۔

میں میانوالی سے گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے گاؤں آیا ہوا تھا۔

عصر کا وقت تھا۔ سلیٹی رنگ کا ایک دیو ہیکل ٹرک ہمارے گاؤں میں داخل ہوا۔ بچے اس کے پیچھے دوڑنے لگے۔ وہ مسجد کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کے انجن کی آواز تھم گئی۔ میں مسجد کے حاشیے پر کھڑا تھا۔ اس میں سے پچاس ساٹھ آدمی کود کود کر اترے۔ سب یہی سمجھے، واپڈا والے کسی لائن کی مرمت کے سلسلے میں آئے ہیں۔ میری نظر فرنٹ سیٹ سے اترنے والے شخص پر پڑی تو میں خوشی سے اُچھلا۔

محمد یار عاصی اتر رہے تھے۔

نانا جان کے گھر کے پچھواڑے چارپائیاں بچھا کر ہم نے مہمانوں کو بٹھایا۔ کیکر اور شرینہہ تلے رونق اُتر آئی۔ اسی دوران عاصی صاحب میرے پاس آئے اور کہا۔

دھیمی آواز میں '۔۔۔ چائے کا نہ کہنا۔ آدمی بہت زیادہ ہیں۔ وہ آواز کی مٹھاس آج بھی سماعتوں میں رس گھولتی ہے۔ ان کا کہنا کہ تم کو ملنا تھا۔ دیکھنا تھا۔ دیکھ لیا۔

ماں۔۔۔

میں عاصی صاحب کو بٹھا کر گھر آیا۔ تم سے ساری بات کہی۔

بیٹا۔۔۔ ان کو بٹھاؤ۔ میں چائے بناتی ہوں۔

لیکن ماں جی۔۔۔ وہ تو پچاس ساٹھ لوگ ہیں۔

تو کیا ہوا بیٹا۔۔۔ میرے بیٹے کے ہزار دوست بھی آجائیں تو میں چائے خوشی سے بنادوں بس تم جاؤ۔

ان سے باتیں کرو۔ چائے ابھی آئی۔

دالان کے سامنے ہمارا چولہا تھا۔ ان چولہوں میں لکڑیاں چٹخنے اور دھڑ دھڑ جلنے لگیں۔ آگ کے دہکتے الاؤ پر ایک طرف چائے کے لیے پتیلا دھرا تھا اور دوسرے چولہے

پر امی نے پیتل کی کڑھائی رکھ کر اس میں سوجی کا حلوہ بنانا شروع کر دیا۔

اور باہر شریہنہ کی چھاؤں تلے محمد یار عاصی پریشان ہو رہا تھا۔

یار۔۔۔ یہ تم نے ہم کو روک کیوں لیا۔ چائے کی ضرورت کیا تھی۔۔۔؟ پانی پلا دیا ہے تم نے یہی بہت ہے۔ اس کے بعد کسی تکلیف کی ضرورت نہیں۔ ابھی ہم گفتگو کر ہی رہے تھے اور محمد یار عاصی سوچ کے ٹیلے پر پریشان بیٹھے تھے کہ پیلے رنگ کی ایک بڑی تام چینی کی کیتلی میں چائے اور لکڑی کے ایک کشادہ ٹرے میں پیالیاں سج کر آ گئیں۔

ٹرے میں سوجی کا حلوہ اور چائے' مہمان نوازی' دریا دلی۔۔۔!

یہ ماں کی مٹھاس تھی۔

یہ تم تھیں ماں۔

بے سلوٹ پیشانی کے ساتھ تم نے مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔

وہی لمحہ میرے اندر ٹھہر گیا۔

میرا دستر خواں کشادہ ہو گیا۔

میں نے تم سے کہا۔۔۔ بہو بھی ایسی ہی ڈھونڈ لانا جو مہمان نواز ہو۔ یہ دستر خوان بچھا رہے' مہمان آتے رہیں' دروازے گھر کے کھلے رہیں۔

محمد یار عاصی چائے پی کر گئے۔

اور اس کے بعد سے ہمارے گھر میں دستر خوان لپیٹنے کا رواج ختم ہو گیا۔

دروازہ کھلا ہے۔

دستر خواں بچھا ہے۔

مہمان آتے رہتے ہیں۔

رحمت اترتی رہتی ہے۔

کون کہتا ہے تیس سال گزر گئے ہیں۔۔۔؟

***

ماں۔۔۔

کیپٹل ہسپتال کے لان میں ایستادہ پائن کے بلند قامت درخت اتنے خاموش کیوں ہیں۔کسی کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ کچھ دیر کو آئے اور ان سے باتیں کرے۔ان کے پہلو میں بہت سی کاریں کھڑی ہیں۔ہر کار میں سے ایک ڈاکٹر اترتا ہے‘اور اپنے کمرے کو جاتا ہے۔ڈاکٹروں کے کمروں کے سامنے مریضوں کی لمبی قطاریں ہیں۔صحت کی امید لیے اپنی باری کے منتظر مریض‘ سامنے سڑک کنارے ریڑھی پر فروٹ بیچنے والا بوڑھا شخص‘ سفید لباس میں ملبوس چکنے فرش پر ٹک ٹک کی آواز پیدا کرتی چلتی نرسیں اور باہر انہی درختوں کے درمیان ایک سفید رنگ کی سوزوکی کار جو اپنی آسانی کے لیے ہم ساتھ لے آئے ہیں اور اس کار میں موجود الطاف حسین میانہ‘تمہاری خدمت کے جذبے سے معمور۔۔۔!

وہ رات سرد اور کچھ زیادہ ہی تاریک تھی۔

یا شاید میرے اندر تاریکی بڑھ گئی تھی۔

تمہارے آپریشن کے بعد موت نے حتمی صورت اختیار کر لی۔

کہیں آس پاس گھات لگائے۔

موت کہاں ہے۔۔۔؟

میرے اندر۔۔۔؟

باہر کہیں۔۔۔؟

کیا اس کی بھی کوئی شکل ہوتی ہے۔۔۔؟

اس کا رنگ کیسا ہوتا ہے۔۔۔؟

اور رُوپ۔۔۔؟

میں الطاف حسین کی آواز سے چونکا۔

لالہ۔۔۔میں رات کیپٹل ہسپتال کے لان میں کار کے اندر گزاروں گا۔

نہیں طافی۔۔۔رات سرد ہے۔

لالہ کوئی بات نہیں۔رات کے کسی لمحے میں کوئی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ماں جی کو تکلیف نہ ہو۔

نہیں طافی۔۔رات کو فون میرے سرہانے ہوتا ہے۔

اس نے میری ایک نہ سنی۔کمبل اُٹھایا۔

پائن کے درختوں کے درمیان کھڑی کار کی فرنٹ سیٹ کھولی، کمبل اوڑھا اور سو گیا۔

سات راتیں۔۔۔

پوری سات راتیں اس نے کار میں گزاریں۔

میری ماں کی تیمارداری کرنے والوں کا ایک ایک لمحہ میرے اندر موجود ہے۔زندہ اور سانس لیتا لمحہ۔۔۔!

لالہ۔۔۔خون کا بندوبست کیسے کرنا ہے۔۔۔؟

اللہ کریم ہے۔

میں ڈاکٹر سے کہتا ہوں تینوں بوتلیں میری نکال لے۔

نہیں طافی۔۔۔

ایک بوتل تو میں دوں گا۔۔۔گل میری کی خالہ حاجرہ کے بیٹے عبدالخالق نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

یہ کہہ کر عبدالخالق اپنے مخصوص انداز میں ہنسا۔۔۔

یار شناختی کارڈ' خیر تو ہے۔۔۔؟ میں بہت سالوں سے جب عبدالخالق ایف۔اے

وہاں پہنچتے ہی ایک خاتون سے ملاقات ہوئی۔اس کے چہرے پر زردی کھنڈی تھی۔ وہ ریڈ کراس کی ڈائریکٹر تھی۔ اسے رنج اور ملال تھا کہ دن بھر راولپنڈی کے نواحی علاقوں میں گھومنے اور بستیوں میں ڈھول پھانکنے کے باوجود کوئی بھی رضا کارانہ طور پر خون دینے کے لیے تیار نہیں ہوا۔

اس نے حمید قیصر سے سوال کیا۔۔

آپ اکادمی ادبیات میں سرکولیشن مینجر ہیں۔۔۔؟

جی۔۔۔

آپ اپنے ادارے میں کوشش کر دیکھیے۔

Visiting Cards کا تبادلہ ہوا۔

اسی دوران میں ایک نرس آئی اور اس نے کہا۔

کس کس کا خون لینا ہے۔۔۔؟

اس کا لہجہ ایسا تھا گویا جان لینے کو آئی ہے۔الطاف اور میں اس کے ساتھ چل پڑے۔ پہلے ٹیسٹ کرنے کو تھوڑا سا خون سرنج میں بھرا گیا۔

نشہ‘ چرس‘ ہیروئین‘ ایڈز۔۔۔ یا کوئی اور مہلک بیماری۔۔۔؟

میں مسکرایا۔۔۔

حمید قیصر نے پوچھا۔۔۔خیریت۔۔۔؟

نفرت‘ حسد‘ کینہ‘ بغض اور غیبت کا بھی ٹیسٹ ہونا چاہیے۔

یہ ایڈز سے زیادہ مہلک ثابت ہوتی ہیں۔

بلڈ ٹیسٹ کے بعد مجھے اور الطاف کو بنچوں پر لٹا دیا گیا۔ کمرے کی ڈیزائننگ اس طرز پر تھی کہ ہم گیلری میں کھڑکی کے ساتھ بچھے بنچ پر لیٹے تھے اور اندر کمرے میں خون لینے کا انتظام تھا۔ بازو کھڑکی میں دھرا تھا۔ خون والا بیگ کہیں اندر لٹکا ہوا تھا۔ جو ہماری نظر سے مکمل طور پر اوجھل تھا۔

رگ تلاش کی گئی۔اس میں سوئی چبھی۔۔۔

ہمیں مٹھی میں ایک کپڑے کا رول سا پکڑا دیا گیا کہ اسے مسلسل دباتے رہیں اس سے خون کا بہاؤ بہتر ہو جاتا ہے۔ ہمارے سر پر ریڈ کراس والوں نے دو فرشتے مقرر کر دیے جنہوں نے ہمیں باتوں میں لگائے رکھا۔اسی دوران جوس کے پیکٹ اور ففٹی ففٹی بسکٹ آ گئے۔

الطاف نے کہا۔

لالہ۔۔۔موج ہو گئی بڑی خدمت ہو رہی ہے ہماری۔۔۔!

ریڈ کراس سے کیپٹل ہسپتال لوٹتے ہوئے راستے میں سارے منظر بے رنگ تھے۔

میں سوچ رہا تھا۔

میری ماں کتنے دن کی مہمان ہے۔۔۔؟

ہم زمین کے باسیوں کو اپنی مہمانی کی مدت معلوم ہی کہاں ہوتی ہے۔

کوئی ایک بھی لمحہ ہمارا اپنا نہیں ہوتا۔

کسی ایک لمحے پر بھی ہماری دسترس مضبوط نہیں ہوتی۔

ہر آنے والے اوجھل لمحے پر بے کار کی امید لگائے پوری عمر گزر جاتی ہے۔

وہ بے خبر لمحہ ہمارا ہوتا ہی کب ہے؟

اس کی باگ ڈور کسی اور کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

اس کے ہاتھ میں جس کا ایک لفظ پوری کائنات کو محیط ہے۔

ایک لفظ اور پوری کائنات۔۔۔!

وہ کہتا ہے۔۔۔''کن''پوری دنیا' زمین و آسمان اور جو کچھ کارخانۂ قدرت میں موجود ہے، تخلیق ہو جاتا ہے۔

اور انسان ساری زبانوں کے حروف جوڑ لے ایک بات بھی مکمل نہیں ہوتی۔

اس بسیط و عریض کائنات میں انسان کا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزتا رہتا ہے۔

کوئی چہرہ کب، کہاں اور کیسے داغِ مفارقت دے جائے۔
کہیں نہ کہیں دکھ ہمارے نام لکھے ہوتے ہیں۔
او جھل دکھ!
اور ہمارے مقدر دکھ کی زنجیریں۔۔۔
جن میں ہمیں تخلیق سے پہلے ہی جکڑ دیا گیا تھا۔

آس پاس سے گزرتی کاریں۔ یہ ٹریفک، ان میں بیٹھے سانس لینے کے عمل سے گزرتے انسان اور ان کے ذہن میں جیٹ کی رفتار سے بھی تیز تر بھاگتے خیالات اور منصوبے!

دکھوں کی گھات سے بے خبر۔۔۔
او جھل دکھ!
اور ہمارے مقدر دکھ کی زنجیریں۔۔۔
جن میں ہمیں تخلیق سے پہلے ہی جکڑ دیا گیا تھا۔
پھر بھی۔۔۔
ایک آس، اُمید، چراغ، روشنی، حوصلہ۔۔۔!

الطاف کی آواز سے میں چونکا۔
لالہ۔۔۔ اگر اور خون کی ضرورت ہے تو میں گاؤں سے ویگن بھر لاؤں۔

ماں۔۔۔

یہ وہی الطاف ہے جو ایک سرد صبح گاؤں کی شمالی سمت اپنے گھر کے سامنے چارپائی پر بیٹھا مجھے ملا تھا۔ تِلّے دار چادر اوڑھے، میانوالی کی روایتی تِلّے والی کھیڑی پہنے وہ گھر سے نکلا تھا اور چارپائی کی پائینتی آ کر بیٹھ گیا۔ مجھے کار کے لیے ڈرائیور اور اسے روزگار کی تلاش تھی لیکن اس کے چہرے کی بے فکری سے یوں نظر آتا تھا کہ اسے فکرِ فردا ہے ہی نہیں۔ اپنے امروز میں گم، اس نے میری بات سنی اور ساتھ چل پڑا۔

پائن کے درختوں کے درمیان ریڑھی لگائے رزق کا متلاشی مالٹے اور کیلے ترتیب سے رکھ رہا تھا۔ اس نے اپنی چادر کے پلو سے مالٹے چمکائے۔ پھر ریڑھی کے پہلو میں رکھی لکڑی کی پیٹی کھولی۔ اوپر سے گھاس پھونس اور ردّی اخباری کاغذ الگ کر کے سیب نکالے اور انہیں بھی اپنی چادر کے پلو سے خوب چمکایا اور ریڑھی پر سجا دیا۔

سامنے کوارٹر نما ہوٹل میں بیٹھا گنجا شخص سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔

کھڑکی خالی تھی۔

میں نے اس سے مونگ پھلی کا پیکٹ طلب کیا۔ مونگ پھلی کے ساتھ اس نے لفافے میں اپنی باتوں کا مسالہ بھی ڈال دیا۔ اسے تاریخ تو ازبر تھی ہی۔۔۔ ساتھ میں وہ طبیب بھی تھا۔ اس نے ایک ایسی پھکی ایجاد کی تھی جو دیواروں پر آویزاں اشتہاروں سے قطعی مختلف تھی اور معدے کے السر کے لیے اکسیر تھی۔ وہ ایک زنگ آلود ڈبے میں سے ایک ایسی پڑیا مجھے دینے پر بضد تھا جو کینسر کا یقینی علاج تھا۔ میں نے السر اور کینسر کی پڑیا کی بجائے مونگ پھلیوں پر گزارہ کیا۔ اور مونگ پھلی کے دانے ہتھیلی پر رکھے ان کا بادامی چھلکا اتار کر موتیوں کی طرح سفید دانے چباتا پائن کے درختوں کے درمیان وساوس میں گھرا جانے کہاں نکل گیا۔۔۔

سمت معلوم ہی کہاں تھی۔

موسم بدل گئے۔ پائن کے سارے درخت بیری کے ایک درخت میں بدل گئے۔

ان پر کچے پکے بیر لگ گئے اور بچے پتھر مار کر بیر گرانے لگے۔

ان بچوں میں، میں بھی تھا۔

ماں۔۔۔

ہمارے آنگن میں بیری کا ایک تناور درخت تھا۔ گھر کی بڑی بوڑھی بزرگ عورتوں کی مانند وہ بیری کا درخت، بزرگ درخت، اپنا آنچل پھیلائے ہر موسم میں بیروں سے لدا پھندا بچوں کو بہلاتا وہ درخت کتنا زندہ اور جان دار تھا۔

بچپن میں ہم مدرسے سے لوٹ کر سیدھا بیری کی طرف لپکتے۔

لال لال بیر۔۔۔

پہلے نیچے گرے ہوئے بیروں کو چن لیتے پھر سنگ باری کا مرحلہ آتا۔ اینٹوں کے ٹکڑے چن کر جھولیاں بھر لیتے اور بیری کے اطراف سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نشانہ لیتے، اگر بیروں کا کوئی گچھا اونچی شاخ پر ہوتا تو مقابلہ بازی شروع ہو جاتی، جو اس گچھے کو گرانے میں کامیاب ہو جاتا اس کے حصے میں بیر زیادہ آتے۔

یوں بھی ہوتا۔

کبھی کبھار کسی ایک کو چپکے سے بیری پر چڑھا دیتے۔ اور باقی سب نیچے چادر پھیلا کر اس کے کونے پکڑ لیتے۔ اونچے شہتیر پر پہنچ کر جیسے ہی ٹہنی کو جھنجھوڑا جاتا، تنی ہوئی چادر لال لال بیروں سے بھر جاتی۔

مدرسے سے لوٹ کر یہ روز کا معمول تھا۔

بیر چنتے ہوئے ہمیں اپنی سدھ بدھ نہ رہتی۔ بھاگنا، شور کرنا، پاؤں میں چبھتے کانٹوں سے بے پروا بس بیر چنتے رہنا یہی زندگی تھی اور یہی جنت۔۔۔! پاؤں میں کانٹا چبھ جانے پر اول تو ہم خود ہی انگوٹھے اور انگشتِ شہادت کی چٹکی سے اسے نکال لیتے لیکن اگر کانٹا گہرا اتر جاتا تو مسئلہ گھمبیر ہو جاتا۔

ایسے میں ایک ہی نام تھا۔۔۔

دادی اماں، بڑی اماں جی اور نانی اماں سے بھی نکالنے کو کہتے تو وہ انکار کر دیا کرتی تھیں، اور ان کا کہنا ہوتا تھا۔ یہ کانٹا صرف رضیہ بی بی ہی نکال سکتی ہے۔۔۔

ماں۔۔۔

تمہیں کتنی مہارت تھی کانٹا نکال لینے میں۔

ہم تمہارے سامنے پیڑھی پر آبیٹھتے۔

ہمارا پاؤں تم اپنے گھٹنے پر ٹکا لیتیں، بائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت۔

اور انگوٹھے کی مدد سے تم پہلے کانٹے والی جگہ کو دبا کر جائزہ لیتیں، دبا کر دیکھتیں۔

تمہارے داہنے ہاتھ میں سوئی ہوتی۔

اور پھر اسی جگہ ایک کالا نقطہ' کانٹا جو تمہاری سوئی کی نوک کی زد میں ہوتا۔

تم کانٹا اتنی نرمی' ملائمت اور آہستگی سے نکال لیا کرتی تھیں جیسے مکھن سے بال نکال لیا جائے۔

اور اب ماں۔۔۔

زندگی مسائل' دکھ اور پریشانیوں کے کانٹوں سے اٹی پڑی ہے۔

میری رُوح میں کانٹے پیوست ہیں۔

ان کانٹوں کو کون نکالے۔۔۔؟

کوئی سوئی۔۔۔؟

کہیں انگشتِ شہادت اور انگوٹھے کی چٹکی۔۔۔؟

ماں۔۔۔!

کوئی نہیں۔۔۔!

اور یہ کانٹے ناسُور بنتے جا رہے ہیں۔

ماں۔۔۔تم کہاں ہو؟

میری آواز صدا بہ صحرا کیوں ہوتی جا رہی ہے!

ماں۔۔۔تم تک یہ آواز پہنچ رہی ہے کیا۔۔۔؟

ماں تو بچے کی ایک آواز پر چونک کر پلٹتی ہے۔

ماں تم کہاں ہو۔۔۔؟

کہیں سے تو ہمارے بچپن کے دن لوٹ آئیں۔

بس ایک جھلک دیکھنے کو مل جائے۔

گھٹنے پر پاؤں ٹکا ہو۔۔۔

ماں ہو۔۔۔

لال لال بیر ہوں

سوئی کی نوک ہو۔۔۔

کسی یاد کی بیری کے پتے ہوں!!

***

مجھے واپس جانا ہے۔۔۔

پائن کے درختوں کے اُس پار جو ہسپتال کی عمارت ہے اس میں میری ماں میری منتظر ہے۔

اس کا ایک ہی اکلوتا بیٹا ہے۔

وہ کہتی ہے۔۔

بیٹا۔۔۔غم کیوں کرتے ہو۔۔۔؟ مجھے اللہ نے بلا لیا تو کون سا وہ دیارِ غیر ہے۔اپنا گھر ہی تو ہے۔

ماں میرے چہرے پہ لکھی تحریر کیسے پڑھ لیتی ہے۔۔۔؟

بہت سال پہلے کی بات ہے

میں کویت میں تھا۔

مینا الزور ایک قصبہ تھا وہاں ایک کمپنی میں میری ملازمت تھی۔ایک بار وہاں کویت سٹی سے پکی پکائی روٹی کی سپلائی بروقت نہ پہنچ سکی۔لوگ خبز کی تلاش میں تھے۔روٹی کو عربی میں خبز کہتے ہیں۔ہم ساتھی جس جگہ رہتے تھے وہاں ہمارا معمول تھا کہ بچی ہوئی روٹیاں ایک گٹو میں ڈالتے رہتے تھے۔اس لحاتی قحط میں وہ ہمارے کام آ گئیں۔ہم صبح وہاں سے روٹی نکالتے اسے پانی میں تر کرتے اور گھی لگا کر تل لیتے۔کھانے میں وہ بڑی خستہ اور لذیذ ہوتی۔تین چار روز میں تازہ سپلائی پہنچ گئی۔

کچھ دن گزرے تھے کہ مجھے پاکستان سے ماں کا خط موصول ہوا۔

بیٹا۔۔میں نے خواب میں دیکھا ہے۔تم سوکھی باسی روٹی کھا رہے ہو!

یہ ماں کو کیسے خبر ہو گئی۔۔۔؟

میں نے تو اس بات کا ذکر اپنے آپ سے بھی نہیں کیا تھا۔

یہ کون سی Frequency ہے۔۔۔؟

ہزاروں میل کی دوری کو کس نے بے معنی کر کے رکھ دیا۔

ماں۔۔۔

مجھے یاد ہے میں نے تم کو لکھا تھا۔

یہاں تو رزق کی اتنی فراوانی ہے کہ عرب امرا کے گھر کام کرنے والی خادمائیں صبح دم کوڑے کے ڈرم میں اتنے بہت سے بچے ہوئے چاول، سالن اور روٹیاں پھینک جاتی ہیں۔

مجھے واپس جانا ہے۔۔۔

پائن کے درختوں کے اس پار جو ہسپتال کی عمارت ہے اس میں میری ماں میری منتظر ہے۔

لیکن میرے پاؤں میں بیری کا کانٹا ہے۔

میں اپنے گھر کی اس قدیم ٹانچی میں چھپنا چاہتا ہوں۔

جواب صرف عہدِ رفتہ کی یاد ہے۔

سرجن نوید اشفاق نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔

ہم ماں جی کو آٹھ دس دن میں ڈسچارج کر دیں گے۔

جی۔۔۔

میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ کینسر کا دنیا میں کہیں علاج نہیں ہے۔ آپ کو اگر کوئی مشورہ دے تو بھی کوئی اور علاج نہیں کرنا۔ کسی اور ہسپتال میں دھکے نہیں کھانے۔ ماں جی کو تکلیف نہیں دینی۔

ان کا ایک ہی علاج ہے۔۔۔ خدمت اور صبر۔

میں اپنے گھر کی اس قدیم ٹانچی میں چھپنا چاہتا ہوں، جواب صرف عہدِ رفتہ کی یاد ہے۔

یہ اس عہد میں تعمیر کی گئی تھی جب خانقاہ سراجیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ میرے بچپن کی تختی پر اب بھی ٹانچی موجود ہے۔

مسجد کی جنوبی سمت کنواں کھودا گیا۔ وہاں سے ایک پائپ لائن گھر تک بچھائی گئی۔

اور ایک ایسی عمارت کی بنیاد اٹھائی گئی جو عجوبہ روزگار تھی۔۔۔! اس عہد میں ایسی عمارت کا تصور ہی ناپید تھا۔ ایک بہت بڑا حوض بنایا گیا۔ حوض بھی زمین کی سطح سے چار فٹ اُونچا اُٹھایا گیا۔ حوض کے اوپر ایک وسیع و عریض برآمدہ بنایا گیا اور پھر حوض کے چہار اطراف پائپ لگا کر مسجد کی طرز پر ٹونٹیاں لگی تھیں۔ یہ وہ عہد تھا جب ابھی گھروں میں ڈول اور رسی سے پانی کھینچنے کا رواج تھا۔ ہینڈ پمپ کا بھی تصور نہیں تھا۔ اس عہد میں خانقاہ سراجیہ میں خودکار پانی کا نظام نصب کیا گیا۔ مسجد کی جنوبی سمت جو پانی کا کنواں تھا، وہاں بیل جوت دیے جاتے۔ پانی پائپ لائن کے ذریعے حوض میں گرتا اور پھر نالیوں کے ذریعے Circulate کرتا۔ ٹانچی میں چھے غسل خانے بھی تھے اور ان میں سرد گرم پانی کا بھی انتظام تھا۔ قریباً ساڑھے چھے فٹ کی اونچائی پر دو ٹونٹیاں نصب تھیں ایک سے گرم پانی اور دوسری سے ٹھنڈا پانی آتا تھا۔

ہمارے سنِ شعور تک ٹانچی بوسیدگی کا شکار ہونے لگی تھی۔

پیتل کی مضبوط ٹونٹیاں، منقش غسل خانے، غسل خانوں کی دیواروں پر مینا کاری، دیواروں سے اکھڑتا پلستر، ابھی کل کی بات ہے۔ آج کا قصہ ہے۔ ہمارے ہوش سنبھالنے تک گھروں میں ہینڈ پمپ لگ چکے تھے۔ جنوبی سمت کا کھوہ اندھی ڈل بن چکا تھا۔ اس میں آسیب کا بسیرا تھا۔ دیواروں پر کائی جم گئی تھی۔ ہم اس میں جھانکتے، آواز لگاتے اور اپنی ہی آواز کی بازگشت سن کر خوش ہوتے۔ پتھر پھینکتے اور گدلے سبز پانی میں سانپ دیکھتے۔

کھوہ ویران ہوا تو ٹانچی کی سپلائی بھی منقطع ہو گئی۔

ٹانچی بے رُوح ہو گئی۔

بالکل ایسے ماں۔۔۔

جیسے تم بِن میرا گھر بے رُوح ہو گیا ہے۔

اک ہوک سی اٹھتی ہے ماں۔

وہ دن کیا ہوئے جب ہم ٹانچی میں لکن میٹی کھیلتے تھے۔

رات میں دادی اماں پیتل کی گاگر انگاروں پر رکھ دیا کرتی تھیں۔صبح نمازِ فجر سے پہلے اس کے نیچے آگ دہکا دیا کرتی تھیں۔ہمیں اٹھنے پر گرم پانی ملا کرتا تھا۔

ٹانچی رہی

نہ دادی ماں رہی

پیتل کی گاگر کھو گئی۔۔۔

وقت کا پانی جانے کہاں بہہ گیا

بیری کا درخت سوکھ گیا۔

جنوبی سمت کا کھوہ اندھی ڈل بن چکا تھا۔

اس میں آسیب کا بسیرا تھا۔دیواروں پر کائی جم گئی تھی۔

ہم اس میں جھانکتے' آواز لگاتے اور اپنی ہی آواز کی بازگشت سن کر خوش ہوتے۔ پتھر پھینکتے اور گدلے سبز پانی میں سانپ دیکھتے۔

ماں۔۔۔

اب پوری زندگی ایک اندھی ڈل میں بدل گئی ہے۔

مسائل کے گدلے پانی میں تفکرات کے سانپ ہیں۔

ہم اپنی ویران روح کے کنویں میں جھانکتے ہیں۔

تو خوف رگوں میں خون کو منجمد کرتا ہے۔

زندگی کی اس اندھی ڈل میں کسی کو آواز دیں

تو۔۔۔اپنی ہی آواز آسیب کی بازگشت بن کر پلٹتی ہے۔

ماں۔۔۔

اب زندگی کے کنویں میں جھانکتے ہوئے خوف آتا ہے۔

ٹانچی رہی۔

نہ دادی ماں رہی۔

پیتل کی گاگر کھوگئی۔۔۔

وقت کا پانی جانے کہاں بہہ گیا۔

پائن کے درختوں کے اس پار جو ہسپتال کی عمارت ہے اس میں میری ماں میری منتظر ہے۔

اس کا ایک ہی بیٹا ہے۔

***

رات کے بے کراں سناٹے میں کسی ایمبولینس کا سائرن گونجا ہے۔
مجھے نیند نہیں آرہی
شگفتہ سوگئی ہے۔ بچے نیند کی آغوش میں ہیں۔
ماں مجھے جاگنا ہے
اپنے آنسو چن کر اپنی تسلی کا خود ہی سامان کرنا ہے۔
آنسو پھول تو نہیں ہیں جو دامن بھر لیا جائے۔

ماں۔۔۔

اتنا یاد تو نہ آیا کرو۔
میرا وجود ٹکڑوں میں بٹ جاتا ہے۔
مجھے اپنے ٹکڑے خود ہی چننے اور جوڑنے ہوتے ہیں۔
کوئی ٹکڑا اپنی جگہ نہ بیٹھے تو اندر کوئی روتا ہے۔ باہر کوئی ہنستا ہے۔
ان اندر باہر کے موسموں نے مجھے کھوکھلا کر دیا ہے۔

ماں۔۔۔

جب میں آنسو لے کر تیری لحد پر آتا ہوں تو تجھے میری موجودگی کا احساس تو ہوتا ہے نا۔۔۔؟

ماں کو خبر ہو جاتی ہے۔
بیٹا۔۔ میں نے خواب دیکھا ہے۔ تم سوکھی باسی روٹی کھا رہے ہو!
یہ ماں کو کیسے خبر ہو گئی۔۔۔؟

میں نے تو اس بات کا ذکر اپنے آپ سے بھی نہیں کیا تھا۔
یہ کون سی Frequency ہے۔۔۔؟
ہزاروں میل کی دوری کو کس نے بے معنی کر کے رکھ دیا۔

ماں۔۔۔

میں اداکار ہو گیا ہوں۔
میں اب مصروف رہنے کی کامیاب اداکاری کر لیتا ہوں۔
مصروفیات پالتا اور ان کی پرورش کرتا ہوں۔
پھر بھی
تمہاری یاد کا عصا ان کو نگل جاتا ہے۔
تم سچ ہو۔۔۔
باقی سب مایا ہے۔۔۔
پائن کے درخت بہت دور رہ گئے۔
یہ میرا گھر ہے۔
اب بکائن اور توت کی چھاؤں میں ماں کی چارپائی بچھی ہے۔
ماں گھر آ گئی ہے۔
تپتی دوپہریں ہیں۔۔۔
جھڑتا سایہ ہے۔
باقی سب مایا ہے۔
سب مایا ہے، سب ڈھلتی پھرتی چھایا ہے۔
اس عشق میں ہم نے جو کھویا جو پایا ہے۔
جو تم نے کہا ہے، فیض نے جو فرمایا ہے۔
سب مایا ہے۔

ایک تمہاری یاد سونا ہے۔

ماں باقی ساری باتیں، ساری یادیں۔

پیتل، تانبا اور جست

ماں نیند نہیں آ رہی۔۔۔

لوری تو سنادو

نیند آ جائے گی مجھ کو

وہ نیند جو کئی سال سے روٹھ گئی ہے۔

اب تو۔۔۔

ٹرینکولائیزرز بھی نیند کو آواز دیں تو کہا نہیں مانتی

جانے کس دیس کو سدھاری وہ نیند پیاری

ماں۔۔۔

مجھے اور کیا لکھنا ہے۔۔۔؟

معلوم کہاں۔۔۔؟

ماضی کی کھڑکی کھلی ہے۔ میرے سامنے جو لینڈ سکیپ ہے اس میں منظر رنگ بدلتے ہیں۔ سامنے پھر میرے صحن کا منظر ابھر رہا ہے۔ شریہہ کے درخت کے ساتھ چھپر کے نیچے ماں لکڑی کے فریم میں کپڑا کس کر کڑھائی کر رہی ہے۔ سامنے وہ کمرہ اُونگھ رہا ہے جس میں بچپن کی تپتی دوپہریں گزرتی تھیں۔ ابھی گاؤں میں بجلی نہیں آئی تھی۔ ابو اس کمرے کے فرش پر ریت بچھوا دیا کرتے تھے اور پھر اس پر پانی کا خوب چھڑکاؤ کیا جاتا۔ اس کمرے میں کپڑے کی جھالر والا مستطیل نما پنکھا نصب تھا۔ وہ لوہے کے بڑے بڑے کڑوں کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔ پنکھے کے ساتھ ایک رسی بندھی ہوئی تھی۔ دوپہر میں چارپائیاں بچھا دی جاتیں۔ ایک کالی کلوٹی لڑکی کمرے میں بیٹھ کر رسی کھینچنے لگتی۔ اس کھینچنے کے عمل سے پنکھے کی جھالر میں ارتعاش پیدا ہوتا۔ ہوا گیلی ریت کی وجہ سے ٹھنڈی محسوس ہوتی اور ہماری

آنکھ لگ جاتی۔

لڑکی رسّی کھینچتی رہتی۔

پنکھے سے مرزا کی بائیسکل کی آوازیں نکلتی رہتیں۔

لڑکی بھی اُونگھنے لگتی۔ چونکتی اور پنکھا کھینچنے کے عذاب سے گزرنے لگتی۔

ماں کو لڑکی کا پنکھا کھینچنا اچھا نہیں لگتا تھا' وہ کہتی تھی' یہ ظلم ہے۔ بھلے سے ایک گھنٹے کے لیے سہی۔۔۔!

ماں۔۔۔

گرمی بڑھ رہی ہے آپ اندر چلیں۔

کینسر پھیل رہا ہے۔

ماں کا چہرہ معدوم ہوتا جا رہا ہے۔

ہڈیاں اُبھر آئی ہیں

ماں۔۔۔

تم نے کہا ہے

بیٹا۔۔۔ ایئر کنڈیشنر میں لیٹنے سے مجھے سکون ملتا ہے۔

گھر کی مشرقی دیوار کی اس پار لنگر کے صحن سے اسما کی آواز آ رہی ہے۔ شاید وہ ادھر کو ہی آ رہی ہے۔ وہ دن میں ان گنت بار تمہاری بیمار پرسی کو آتی ہے۔

بھائی امی کیا کہہ رہی ہیں۔

ایئر کنڈیشنر کی بات ہو رہی ہے۔

تو بھائی ایئر کنڈیشنر دن رات چلتا رہے۔ بجلی کا بل میں دوں گی۔

بجلی تو بہت مہنگی ہے بیٹا۔۔۔!

ماں تم اس کی فکر ہرگز نہ کرو۔ بجلی مہنگی ہے یا سستی۔۔۔

ماں۔۔۔ اسے کسی کالی کلوٹی لڑکی نے نہیں کھینچا۔ اسے اونگھ بھی نہیں آتی۔

ایئر کنڈیشنز دن رات چلتا رہا۔

ماں کے اندر کینسر کی گرمی سوانیزے پر پہنچ گئی۔

ماں جانے کہاں چلی گئی۔

بستر پر تو ہڈیاں رکھی ہیں۔

خوراک حلق سے نہیں اترتی۔

بیٹا میں کیسے کھاؤں۔۔۔؟ حلق سے نیچے کچھ بھی تو نہیں اترتا۔ بیٹا۔۔۔ بچوں والا سری لیک لے آؤ۔ شاید وہ میں نگل سکوں۔ میں سری لیک لے آیا۔ اس کے بھی ایک دو چمچ حلق سے بمشکل اُترتے۔

تمہاری بہو بار بار پوچھتی۔۔۔

خالہ کوئی اور چیز بنالاؤں۔۔۔؟

نہیں بیٹا تم پہلے ہی میری وجہ سے اتنی تکلیف میں ہو۔

خالہ تکلیف کون سی، یہ تو میرا فرض ہے۔

شگفتہ باورچی خانے میں ناشتہ بنا رہی تھی۔ باورچی خانے کا ایک دروازہ برآمدے میں کھلتا ہے۔ ماں چارپائی پر لیٹی تھی۔ وہ کچن میں ناشتہ کرتے بچوں کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھی یا اداس۔۔۔؟ یہ فیصلہ کرنا میرے لیے مشکل تھا۔ ماں نے اشارے سے شگفتہ کو بلایا۔

کینسر۔۔۔ نطق کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

نحیف آواز۔۔۔

مدرسے کے کنویں سے آتی ہوئی میری آواز کی بازگشت۔۔۔

بیٹا۔۔۔ مجھے آٹے کا پیڑا اُٹھا دو۔۔۔ ماں نے شگفتہ سے کہا۔

خالہ۔۔۔ آٹے کا پیڑہ کس لیے۔۔۔؟

لے آؤ بیٹا۔۔۔ میں اپنے بیٹے کو پراٹھا بنادوں

شگفتہ آٹے کا پیڑا بنالائی۔ ماں کی ہتھیلی پر رکھا۔ ماں نے بمشکل دوسرا ہاتھ پیڑے

کے اوپر رکھا۔ مسکرائی

اور کہا اب اس کا پراٹھا بنا دو۔۔۔

باہر سنبل کے درختوں میں کوئل بولی۔

اس کی آواز میں ایک درد کی لے تھی، جو میرے دل سے ہوتی ہوئی پوری کائنات میں پھیل گئی۔

ماں نے مجھ سے کوئی بات کہی ہے۔۔۔

جی۔۔۔

تمہیں شریںہہ اور چھپر یاد ہے۔

یاد ہے ماں۔۔۔ چھپر میں پرندوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ ساری دوپہر چڑیاں اپنے بچوں کے لیے دانہ دنکا چن کے لاتی تھیں۔ چھپر کے ساتھ متصل شریںہہ کا درخت تھا۔ اس کے تنے میں کالی بھڑوں کا بسیرا تھا۔ ان کی بھنبھناہٹ ان کے ڈنک سے بھی زہریلی محسوس ہوتی تھی۔ دادی اماں آگ جلانے کے لیے چھپر کے نیچے خشک لکڑیوں کا ذخیرہ محفوظ رکھتیں۔ بارش کے دنوں میں ان کو اس بات کی بہت فکر رہتی تھی۔ ایک چولہے پر دودھ ابلتا رہتا دوسرے پر مٹی کی کٹوی میں سالن پکا لیا جاتا۔ دادی اماں گاہے گاہے لکڑی کی ڈوئی سے سالن کو ہلا لیتیں اور ادھر توے پر روٹی ڈال دیا کرتی تھیں۔ پٹھو گرم کھیلتے ہوئے ہم کئی بار توے سے اتری تازہ روٹی اٹھا کر بھاگ جاتے۔ دادی اماں بلی اور کووں کو مارنے کے لیے جو چھڑی ساتھ رکھتی تھیں، ہمیں مارنے کی بجائے اسے زور زور سے زمین پر مارتیں اور اگلی روٹی توے پر ڈال دیا کرتیں۔

ماں۔۔۔ یاد ہے۔۔۔ یہ آج کی بات ہے۔ کیوں کہ میرے اندر آج زندہ ہے۔

خالہ۔۔۔ پراٹھا پک گیا ہے۔

لے آؤ۔۔ بیٹا۔

دادی اماں چولہے میں پانی کو چھینٹا مار کر آگ بجھایا کرتی تھی۔ شگفتہ نے گیس کا بٹن

بند کیا اور پراٹھا لے کر برآمدے میں آ گئی۔ دھوپ بوڑھے شیشم میں سے چھن چھن کر آ رہی ہے۔

ماں جانے کہاں چلی گئی۔
بستر پر تو ہڈیاں رکھی ہیں۔
سارے منظر ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے ہیں۔
جانے چھپر، شر- نیہہ اور ماں باپ کیوں چلے جاتے ہیں۔۔۔؟
کوئی بھی لوٹ کر نہیں آتا۔
چھپر، شر- نیہہ اور ماں باپ۔۔۔ نہ بھڑکی ڈنکیلی آواز۔
دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزتا رہتا ہے۔
کوئی چہرہ کب، کہاں اور کیسے داغِ مفارقت دے جائے۔
کہیں نہ کہیں دکھ ہمارے نام لکھے ہوتے ہیں۔
اوجھل دکھ
اور ہمارے مقدر دکھ کی زنجیریں۔۔۔
جن میں ہمیں تخلیق سے پہلے ہی جکڑ دیا گیا تھا۔

***

صبح کا وقت تھا۔

ہم باورچی خانے میں ناشتہ کر رہے تھے۔ سورج کی کرنیں شیشم سے گزر کر مشرقی سمت کی کھڑکیوں پر دستک دے رہی تھیں۔ ماں۔۔۔ تم نے باورچی خانے کی کھڑکی کی جالی پر دونوں ہاتھوں کی اوک سے جھانکتے ہوئے کہا:

بیٹا۔۔۔ میری بھوک مر گئی ہے۔

اس سانحے کے بعد مجھے وقت کی رفتار کے پیمانے یاد نہیں رہے

ایک رات میرے اندر اُترتی جا رہی ہے۔

بیٹا۔۔۔! تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ پر دھرا تھا۔

جی۔۔۔ میں سو ہی کب رہا تھا۔

بیٹا۔۔۔ مجھے یقین ہو گیا ہے۔ میں زندہ نہیں رہوں گی

میں نے گھڑی دیکھی رات کا ایک بجا تھا۔۔

پھر دھیمی آواز میں تم نے مجھے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک واقعہ سنایا۔ جانے وہ واقعہ تم نے کس کتاب میں پڑھا۔ تمہارا کہنا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کے گھر میں ایک چھپر تھا۔ ان کی ماں بیمار تھی۔ وہ دن کو مزدوری کرتے اور ماں کو چھپر میں چھپا جاتے۔ پھر پوری رات جاگ کر اپنی ماں کی خدمت کرتے۔ وہ اللہ کے پیغمبر تھے۔

ماں۔۔۔

تم نے متعدد بار یہ واقعہ مجھ کو سنایا۔

مجھے بہت اچھا لگا۔۔۔

مجھے اس واقعے کی تاریخی صحت تلاش نہیں کرنی۔

اس کی صحت اسی رات مجھے مل گئی تھی جب تو نے کہا تھا۔

بیٹا۔۔۔ مجھے یقین ہو گیا ہے۔ میں زندہ نہیں رہوں گی

میں نے گھڑی دیکھی رات کا ایک بجا تھا۔۔۔

نہیں ماں۔۔۔ میری کل سرجن مصطفی کاظمی سے بات ہوئی تھی

کیا کہتے تھے۔۔۔؟

کہہ رہے تھے۔ یہ تکلیف گرمی کی شدت کی وجہ سے ہے۔ سردیاں آنے تک آپ مکمل طور پر صحت یاب ہو جائیں گی۔۔۔ بس تھوڑا سا انتظار اور۔۔۔!

ماں۔۔۔ تم نے مجھے پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ سنایا اور دعا دی

یہی دعا میری میراث ہے۔

میں نے گھڑی دیکھی رات کا ایک بجا تھا۔۔

رات کیسے گزری۔۔۔؟

نہیں معلوم

کب آنکھ لگی۔۔۔ کب سورج کی پہلی کرن دیواروں پر پڑی

موت کا سناٹا بڑھتا جا رہا تھا

دن گزر رہے تھے اور موت سرک رہی تھی

دھڑکے میرے وجود کے ساتھ چمٹ گئے۔

گھر میں

ڈیوٹی پر

موٹر سائیکل چلاتے ہوئے

میں گھبرا کر چونک اٹھتا۔۔۔ میری دل کی دھڑکن بے ترتیب ہو جاتی۔

ٹیلیفون کی گھنٹی نے سب سے زیادہ اعصاب کو کمزور کر دیا۔

ڈیوٹی پر کام کے دوران میں اگر کوئی ساتھی کہتا کہ آپ کا فون ہے تو میرے چہرے کا رنگ اُڑ جاتا۔

موت میرے خون کے خلیوں میں دوڑ رہی تھی۔

ڈیوٹی سے لوٹ کر آتا تو مجھے گھر کا کوئی کام یاد نہیں رہتا تھا۔

بس اک ماں یاد رہتی۔۔۔

ماں کی یادداشت کی کھڑکی سے کینسر اندر داخل ہو رہا تھا۔

وہ باتیں اور منظر بھولنے لگیں۔

ایک ہی بات مجھے بلا کر بار بار پوچھنے لگیں۔

28 مئی 1998ء کو پاکستان نے ایٹمی دھماکے کیے تو بچے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ وہ بار بار ٹی وی آن کرتے اور اونچی آواز میں خبریں سنتے۔ ان کے چہروں پر جوش تھا۔ پوری قوم سرشار تھی۔

ماں نے مجھے بلایا اور پوچھا۔

یہ بچے شور کیوں کر رہے ہیں اور خوشی کس بات کی منا رہے ہیں۔۔۔؟

ماں۔۔۔ پاکستان ایٹمی قوت بن گیا ہے۔

کیا پاکستان نے بھی ایٹمی دھماکے کر دیے۔۔۔؟

ماں ویسے ہی نہیں کر دیے۔ ہندوستان کے پوکھران کے دھماکوں کے جواب میں کیے ہیں۔

اچھا۔۔۔ ماں نے صرف اتنا کہا اور خلاؤں میں کھو گئی۔

چند گھنٹے ہی گزرے ہوں گے کہ مجھے بلایا اور کہا۔

بیٹا نواز شریف کو فون کرو اور کہو کہ اگر جنگ ہو تو ہندوستان پر ایٹم بم بالکل نہ پھینکے۔

ماں فکر نہ کرو۔ ہماری قیادت اتنی ناعاقبت اندیش نہیں ہے۔

پھر بھی بیٹا' آنے والے وقت کے بارے کیا کہا جا سکتا ہے۔ امریکہ نے بھی تو ہیرو

شیما اور ناگا ساکی پر ایٹم پھینک دیا تھا۔ اسے کوئی روک سکا تھا۔

ماں وہ امریکہ ہے۔

زیادہ باتیں نہ بناؤ اور نواز شریف کو فون کرو۔

رات میں ماں نے مجھے پھر بلا کر پوچھا۔

نواز شریف کو فون کر دیا ہے۔۔۔؟

ماں رابطہ نہیں ہو رہا۔

اچھا۔۔۔ اور گہری چپ۔

وہ رات بہت مشکل اور تاریک تھی۔

ماں کی یادداشت کی کھڑکی سے کینسر اندر داخل ہو رہا تھا۔

وہ باتیں اور منظر بھولنے لگیں۔

مجھے پھر نیند نہیں آ رہی تھی۔

میں نے قلم سنبھالا۔

سب سو گئے تھے اور میں جاگ رہا تھا۔

میں لکھنے کے عمل سے گزرتا رہا اور لکھ لکھ کر کاغذ ایک طرف ڈھیر کرتا رہا۔

میرے اندر حبس بڑھ رہا تھا۔ اسی رات میں نے افسانہ ''حبسِ دوام'' مکمل کیا۔

صبح ناشتے پر ماں نے پھر وہی سوال دہرایا

بیٹا۔۔۔ نواز شریف کو فون کر دیا ہے۔

ماں رابطہ نہیں ہو رہا۔

بیٹا۔۔۔ جلدی کرو۔ ہندوستان کے عوام کا کیا ہوگا۔

ماں ہندوستان ہو، پاکستان یا کرۂ ارض کا کوئی اور ملک ہو جنگ کا ایندھن ہمیشہ ہم عوام ہی ہوتے ہیں۔

ماں بستر کو گھر کرتی جا رہی تھی۔

اس کی آنکھ کے دریچوں میں صرف دو بار آنسوؤں کے پرندے اُترے۔

ایک دن دوپہر کے وقت ماں کی آنکھ سے دو آنسو گرے اور اس نے چپ سادھ لی۔

اور دوسری بار اس صبح جب خالہ امی کویت کے لیے روانہ ہوئیں۔

ماں چار پائی پر بیٹھی تھی

جوں ہی خالہ امی شیشم کے نیچے سے گزر کر نظروں سے اوجھل ہوئیں۔

دو آنسو گرے اور ماں نے چپ سادھ لی۔

ماں بستر کو گھر کرتی جا رہی تھی اور گھر خالی ہوتا جا رہا تھا۔

ڈاکٹر نے گلوکوز کی ڈرپ اور انجکشن تجویز کیے۔

عبدالقدوس سے آنے کو کہا۔

ماں کے ہاتھ اتنے نحیف ہو گئے تھے کہ سوئی ٹھہرتی ہی نہیں تھی۔

دو گھنٹے عبدالقدوس ماں کا ہاتھ تھام کے سوئی پکڑ کے بیٹھا رہا۔ ماں پر بیہوشی کی کیفیت تھی۔ شام ڈھلے میں نے عبدالقدوس سے جانے کا کہا تو اس نے انکار کر دیا۔

وہ ماں کے کینسر سے گزر چکا تھا۔ اس نے رات میرے گھر میں قیام کیا۔

وہی ایک رات دوستی کی ساری زندگی کو محیط ہے

ماں ہوش میں کیوں نہیں آ رہی۔۔۔؟

خوراک کا سلسلہ کیوں منقطع ہو گیا۔

بیٹا۔۔۔ بچوں والا سری لیک لے آؤ۔

سارے سلسلے دھرے رہ گئے۔

ماں کسی اور سفر میں تھی اور ہم ہوش میں آنے کا عبث انتظار کھینچ رہے تھے۔

کون سی رات زندگی کی آخری رات ہے۔

کسے معلوم۔۔۔؟

گرمی کے موسم کی شروعات تھیں۔ دن کی تپش خاصی بڑھ چلی تھی۔ ایک روز صبح اعلان ہوا کہ آج سارے دن کے لیے Shut down ہے اور بجلی شام کو آئے گی۔ ماں نے کہا۔

بیٹا۔۔۔ دن کیسے گزرے گا۔

ماں آپ کی دعا سے۔

لے۔۔۔ ہے نا پاگل۔۔۔ دعا سے پنکھا نہیں چلتا۔

ماں۔۔ تمہاری دعا سے اللہ میاں کا پنکھا چل پڑے گا۔

تو اللہ میاں کا پنکھا نہ چلا، میں آج کا دن عبدالقدوس کے گھر گزاروں گی۔

ماں۔۔۔

عبدالقدوس کے گھر پہنچے تو اس کے گھر عید کا سماں ہو گیا۔

میں نے دعا کی۔۔۔ اے ربِ کریم! بجلی تو داغِ مفارقت نہ دیا کرے۔

کیا آنے والے موسم گرما میں ماں نہیں ہو گی۔۔۔ یقیناً نہیں ہو گی۔۔۔

اے۔۔۔ ربِ کریم تو ماؤں کو کیوں بلا لیتا ہے۔۔۔؟

ساری عمر کے لیے دھوپ کا سائبان کیوں تان دیتا ہے۔۔۔؟

ہم زمین کے باسیوں کے دکھ بھی عجیب ہوتے ہیں۔ شکوے کی اجازت بھی چھین لی جاتی ہے۔ آنکھ کے آسمان سے اترنے والی بارش سے گرمی کی شدت تو کم نہیں ہوتی، نا۔۔۔

ماں۔۔۔ کی آنکھ کے دریچوں میں صرف دو بار آنسوؤں کے پرندے اُترے۔

ایک دن دوپہر کے وقت اس کی آنکھ سے آنسو گرے اور اس نے چپ سادھ لی۔

اور دوسری بار اس صبح جب خالہ امی کویت کے لیے روانہ ہوئیں۔

ماں چارپائی پر بیٹھی تھی۔۔۔

دو آنسو۔۔۔ اور چپ۔۔۔!

***

میں ایک دم اپنی عمر سے بہت بڑا ہو گیا۔

امامہ۔۔۔ناشتہ نہیں کر رہی۔

شگفتہ کی آواز پر میں نے بیٹی سے ناشتے کا پوچھا تو وہ پھر چھلک پڑی۔

باہر سکول وین ہارن دے رہی تھی اور اندر کمرے میں آسمان سے فرشتے اُتر رہے تھے۔

اسماء تھی۔۔۔میری بہن۔۔۔!

شگفتہ تھی۔۔۔میری ہمدمِ دیرینہ دوست، غم گسار۔۔۔!

ماں تھی۔۔۔میرا سایہ، میری سانس۔۔۔!

اور آسمان سے فرشتے اتر رہے تھے قطار اندر قطار۔۔۔

میری سماعت میں ایک آواز رس گھول رہی تھی

''یٰۤاَیَّتُهَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّةُ۔''

اے اطمینان والی روح

''ارۡجِعِیۡۤ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرۡضِیَّةً۔''

تو اپنے ربّ کی طرف لوٹ چل اس طرح کہ تو اس سے راضی وہ تجھ سے خوش۔

''فَادۡخُلِیۡ فِیۡ عِبٰدِیۡ۔''

پس میرے خاص بندوں میں داخل ہو جا۔

''وَادۡخُلِیۡ جَنَّتِیۡ۔''

اور میری جنت میں چلی جا۔

اسماء نے کسی کو آواز دی اور اسے ہزار روپے کا نوٹ پکڑایا۔۔۔جاؤ۔۔۔ابھی بھاگ کر جاؤ اور صدقہ کر دو۔ بکرا جہاں سے بھی ملے فوری تلاش کرو۔۔۔ماں جا رہی ہے۔

میں نے گھر میں دیکھا۔۔۔سارے Wall Clock تھم گئے تھے۔ وقت رُک گیا تھا۔

اسماء تھی۔۔۔اور شگفتہ۔۔۔!

اور آسمان سے فرشتے اتر رہے تھے قطار اندر قطار۔۔۔

ماں کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔

اور آسمان سے اترتے فرشتے میری سانس کھینچنے کو تھے۔

کئی روز سے ماں کے پاؤں میں سوجن تھی۔

میری سماعت میں قرآن کی آواز رس گھول رہی تھی

"یٰاَیَّتُهَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّةُ۔"

اے اطمینان والی روح۔

"ارۡجِعِیۡۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرۡضِیَّةً۔"

تو اپنے ربّ کی طرف لوٹ چل اس طرح کہ تو اس سے راضی وہ تجھ سے خوش

سامنے ٹاہلی کے درخت میں چڑیاں روئیں۔۔۔

ماں نے ایک لمبا سانس لیا۔ اور اپنی منزل کو چل دی

اے میرے ربِ کریم۔۔۔

وہ تجھ سے راضی تھی۔

ماں کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ اسی طرح جیسے بچپن میں میری ماں نے مجھے ہاتھ تھام کر چلنا سکھایا تھا۔

ماں کے ہاتھوں میں نرمی بہت تھی۔

میری نظر پاؤں پر پڑی تو سوجن اُتر چکی تھی۔ ماں کو قرار آ گیا تھا۔

ماں۔۔۔کسی نے بین نہیں کیا

کوئی نوحہ نہیں ہوا۔

پورے وقار کے ساتھ تیرا جنازہ اٹھایا گیا۔

اور تو نے زمین اوڑھ کر آخرت کو گھر کیا۔

امامہ کی آنکھیں خشک کیوں ہیں۔۔۔؟

میری بیٹی روئی کیوں نہیں۔

امامہ تو بیٹی ہی تیری تھی۔ وہ بچپن سے ہی تمہارے پہلو میں سونے کی عادی تھی۔ تم نے اسے نمازِ فجر کے بعد سورۃ یاسین کی تلاوت سکھا دی یہ اس کا معمول ہو گیا۔

امامہ کب روئے گی۔۔۔؟

حفصہ اور اسامہ بہت روئے۔ قدامہ کی ابھی عمر ہی اتنی ہے کہ وہ حیران ہے کہ اچانک اتنے بہت سے لوگ ہمارے گھر جمع ہو گئے۔۔۔؟

جانے والوں کو یہ معلوم کیوں نہیں ہوتا کہ ان کے جانے کے بعد آنگن میں قیامت کیسے اُترتی ہے۔ ان کی ساری عمر کی محبتیں جمع ہوتی ہیں اور ان کو خبر ہی نہیں دی جاسکتی کہ ان کے ملنے کو کتنے لوگ کہاں کہاں سے سفر کی صعوبتیں جھیل کر پہنچے ہیں اور ان کی آنکھوں نے کتنے چراغ روشن کیے ہیں۔

ماں۔۔۔ کسی نے بین نہیں کیا

کوئی نوحہ نہیں ہوا۔

پورے وقار کے ساتھ تیرا جنازہ اٹھایا گیا۔

اور تو نے زمین اوڑھ کر آخرت کو گھر کیا۔

19 اکتوبر 1998ء۔۔۔

آج کیلنڈر تمام ہوئے۔

اب کیلنڈر پر کسی نئی تاریخ کا اندراج نہیں ہوگا۔

جس کیلنڈر پر نظر پڑے گی ایک ہی تاریخ۔۔۔ ایک ہی دن۔۔۔ ایک ہی موسم۔۔۔!

ماں۔۔۔

تمہیں پت جھڑ کے موسموں میں ہی جانا تھا۔

تمہارے بعد موسم نہیں بدلے
تمہیں لحد میں اتار کر پلٹے تو زمانے بدل گئے تھے
''یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىٕنَّةُ۔''
اے اطمینان والی روح۔
''ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً۔''
تو اپنے ربّ کی طرف لوٹ چل اس طرح کہ تو اس سے راضی وہ تجھ سے خوش۔
سامنے ٹاہلی کے درخت میں چڑیاں روئیں۔۔۔

میں نے روکا بھی نہیں اور وہ ٹھہرا بھی نہیں
حادثہ کیا تھا جسے دل نے بھلایا بھی نہیں
جانے والوں کو کہاں روک سکا ہے کوئی
تم چلے ہو تو کوئی روکنے والا بھی نہیں

***

ماں۔۔۔

میرے گھر اور شہر خموشاں کے درمیان سو پچاس قدموں کی مسافت ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں۔

میرا مسکن کون سا ہے؟

یہ گھر جس میں صرف سانس لینے کا عمل باقی رہ گیا ہے۔

یا شہرِ خموشاں۔۔۔؟

جسے تم نے جا آباد کیا ہے۔

میں ایک بے آباد گھر کا باسی ہوں۔

ماں۔۔۔

بتاؤ۔۔۔نا

ہمارا مسکن کہاں ہے؟

یہ گھر۔۔۔؟ یا۔۔۔شہرِ خموشاں؟

اگر یہ گھر مسکن ہے۔۔تو تم کیوں رخت سفر باندھ گئیں۔۔۔؟

اور گر شہرِ خموشاں مسکن ہے۔

تو پھر۔۔۔

ہم اس بے آباد گھر میں کیوں سانس لینے کے عذاب سے گزر رہے ہیں۔۔۔؟

ماں۔۔۔

دو جہانوں کے درمیان بچھی مسافت نامعلوم ہے۔

اس مسافت کو طے کرنے میں جانے ابھی اور کتنی سانسوں کا ایندھن پھونکنا ہے۔

ماں۔۔۔

ہجر اور ملن کے درمیان بچھی صدیوں کی صف پہ ساری عمر سجدہ ریز رہوں تو بھی تمہارا

حق ادا نہیں ہوتا۔

تم وقت کی قید سے ورے جا آباد ہوئیں۔

اور میں۔۔۔

ہجر کے پیڑ تلے بیٹھا اپنی باری کا انتظار کر رہا ہوں۔

زمین گزرگاہ ہے ہمارا مسکن نہیں۔۔۔

بے روح عمارتوں کے درمیان گھومتے ہوئے خیال آتا ہے۔ زمین ہمارا ٹھکانہ نہیں' پھر بھی ہم حق ملکیت جتاتے جتاتے عمر رواں کے سارے اوراق بے ترتیب کر لیتے ہیں۔

خزاں اُتر آتی ہے۔۔۔

جیسے تمہارے جانے سے سارے درختوں کے پتے جھڑ گئے۔

ماں۔۔۔ تمہیں پت جھڑ کے موسموں میں ہی جانا تھا۔

تمہارے بعد موسم نہیں بدلے۔

تمہیں لحد میں اتار کر پلٹے تو زمانے بدل گئے تھے۔

موسم۔۔۔؟

اب ایک ہی موسم ہے پت جھڑ کا۔۔۔

ماں تم موجود تھیں نا۔۔۔ تو۔۔۔ کانٹے پھولوں میں بدل جایا کرتے تھے۔

اب تو بہار کی تدفین کے بعد عمر بھر اس موسم کے لوٹ آنے کا انتظار عبث ہے۔

ماں۔۔۔

کیا تمہارے وجدان نے تمہیں خبر کر دی تھی۔

کہ تمہیں کینسر ہے۔۔۔

گر۔۔۔ تمہیں یہ خبر نہیں تھی۔۔۔ تو پھر تم۔۔۔ زمین اوڑھ کر کیوں سو گئیں۔

کوئی یوں بھی بچوں کو نوکیلی دھوپ میں چھوڑ جاتا ہے۔

ماں۔۔۔

موسم سرکتے رہتے ہیں۔ آنکھیں تمہیں تلاش کرتی رہتی ہیں۔ دل کی نم زمین پر

یادیں ننگے پاؤں ٹہلتی رہتی ہیں۔۔۔

ہم کاموں میں مصروف رہتے ہوئے بھی مگن نہیں رہتے۔تم سے ملنے کی آس نے دم نہیں توڑا۔جیسے ابھی آن ملوگی۔۔۔

پیشانی چوم لوگی۔دکھ چن لوگی۔آنچل پھیلا کر نوکیلی دھوپ سے بچالوگی۔

ماں۔۔۔

سرِشام تمہاری یادیں دل کے آنگن میں چار پائیاں بچھا لیتی ہیں اور جب رات اپنا خیمہ تان لیتی ہے تو خواب نگر کی سیر کو جانے کے لیے میں دن بھر کا تھکا ماندہ تھکن اوڑھ کے سوجاتا ہوں۔تمہارے جانے کے بعد خواب نگر کی سیر ہی وہ راستہ ہے جہاں سے گزر کر عہدِ رفتہ سے ملاقات ہوتی ہے۔

ہر رات امید کا دیا روشن کیے نیند کی گود میں سر رکھ دیتا ہوں کہ صبح جاگنے پر رات کے خواب ہم سفر ہو جائیں۔

ماں۔۔۔

تمہاری جدائی نے ہڈیوں کو بوسیدہ کر دیا ہے۔

ابھی تو ابو کے ایکسیڈنٹ کے زخم میرے اندر تر و تازہ رکھے تھے۔

یہ میرے آنگن میں کینسر کی کونپلیں کہاں سے پھوٹ پڑیں۔۔۔؟

رحمتوں اور برکتوں کے سایہ فگن مہینے کے گزرتے ہی خزاں کہاں سے اُتر آئی۔

ماں کی رحمت بھی مہینے کے اختتام کے ساتھ رختِ سفر باندھنے لگی۔

یہ مہینہ تو اپنی پوری برکتوں اور رحمتوں کے ساتھ قیامت تک سایہ فگن ہوتا رہے گا۔

لیکن ماں تم قیامت تک لوٹ کر نہیں آؤ گی۔

ہم اپنی مستعار زندگی کی آخری عید گزار چکے۔

تم لوٹ کر آؤ گی۔۔۔نہ ہی۔۔۔عید۔

موسم کے آنچل میں جتنے پھول تھے۔رونقیں اور مسکراہٹیں، سایہ اور ٹھنڈک، میٹھی

چھاؤں سب کے سب تمہارے ساتھ رخصت ہوئے۔ اب تو صرف دھوپ کا آنچل ہے۔

دھوپ کے آنچل میں دکھوں کی تپش کے سوا اور ہوتا ہی کیا ہے۔

کتنی خامشی اُتر آئی ہے میرے آنگن میں۔۔۔

رگ و پے میں اترتی یہ خامشی کب سے ہمارا مقدر تھی۔

تقدیر کسے کہتے ہیں؟ ہمارے مقدر کس لوح پر رقم ہوتے ہیں۔۔۔؟

ہمارے محدود علم میں یہ ادراک ممکن ہی کہاں ہے کہ دکھ کہاں کہاں گھات لگائے بیٹھے ہیں۔۔۔

اچانک برس جانے والے دکھ بھی کتنے تکلیف دہ ہوتے ہیں۔

سب اپنے اپنے محور میں مقید ہیں۔۔۔ سورج صدیوں سے سفر میں ہے۔

میرے آنگن میں شیشم کا ایک عمر رسیدہ پیڑ ہے۔ برسوں سے موسموں کے سرد گرم تھپیڑے سہہ رہا ہے۔ سورج کی کرنیں اس کے پتوں پر وقت کی تاریخ رقم کرتی رہی ہیں۔ کتنے موسم اور کتنی نسلیں گزر گئیں؟

وقت کا کرب سہتے سہتے اب تو یہ ناتواں شیشم بھی رخت سفر باندھ رہا ہے۔

ماں۔۔۔ تمہیں پت جھڑ کے موسموں میں ہی جانا تھا۔

ہم روزمرہ کے کاموں میں مصروف رہتے ہوئے بھی مگن نہیں رہتے۔

ایک دیا ٹمٹماتا رہتا ہے۔

جیسے ابھی تم نمازِ فجر کے لیے پیشانی چوم کر جگا دو گی۔

دُکھ چن لوگی۔

آنچل پھیلا کر نوکیلی دھوپ سے بچا لوگی۔

آس کا پنچھی دل کی منڈیر پر منتظر رہتا ہے۔

***

ماں۔۔۔

موسم تو بدل گئے۔

منظر کیوں نہیں بدلے۔۔۔؟

ہمارے صحن میں شیشم کا بوڑھا درخت برگزیدگی کی ردا اوڑھے کئی نسلوں کی محبتوں کا امین تھا۔ اسے کہولت نے آلیا ہے۔ شیشم کے دائیں جانب دالان اور منقش کمرہ اپنی عمر پوری کر چکے ہیں۔ دونوں کی بوسیدہ چھتیں زمین بوس ہو گئی ہیں اور ان میں حشرات الارض کا ڈیرہ ہے۔ کبھی ان میں بھی زندگی سانس لیتی ہو گی۔ قمقمے روشن ہوتے ہوں گے۔ قہقہے گونجتے ہوں گے۔

اب یہ چپ کھڑے سر نہوڑائے عہدِ رفتہ کی مٹتی یادوں کے امین اپنی خاموش زبان سے کئی کہانیاں سناتے ہیں۔ ان کہانیوں کو کون سنے۔۔۔؟

زندگی برق رفتار ہے۔۔۔

ہمارے پاس اتنا وقت ہی کہاں ہے کہ عمارتوں' شکستہ دیوار و در اور کھنڈروں کی زبان سے تاریخ کی کہانی سن لیں۔ اب تو بچے دادی اور نانی سے کہانی سننے کی بجائے کمپیوٹر پر وقت گزارتے ہیں۔ شیشم کی بائیں جانب تین کمرے ایک قطار میں ہیں۔

ماں ان کمروں کا وہی نام ہے۔۔۔

اُبھار والا کمرہ۔۔۔ (مشرقی کمرہ)

وِچالے والا کمرہ۔۔۔ (درمیان والا کمرہ)

ڈِلہا والا کمرہ۔۔۔ (مغربی کمرہ) یہ نام اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تلک ان

خطوط، بچوں کے تعلیمی ریکارڈ کی درستی کے لیے ان کے نام کی الگ الگ فائلیں، قراقلی ٹوپی، پلنگ کے نیچے دھرے پالش شدہ جوتوں کے دو جوڑے، بتیس بور کا پستول، انگلینڈ کی ڈبل بیرل بندوق اور اس کے کارتوس، سب کے سب موجود ہوں گے۔۔۔؟

کمرے کی اندر کی دنیا کیسی ہوگی۔۔۔؟

میں اندر قدم کیسے دھروں۔۔۔؟

ماں مجھے ڈر نے آلیا ہے۔۔۔

بہت تنہا ہو گیا ہوں میں۔۔۔؟

میرے اندر منیر نیازی بھی اپنی تنہائی پر نوحہ خواں ہے۔۔۔

ایک روز میں منیر نیازی کی ایک نظم پڑھ کر بہت رویا:

"کل رات

میں تنہائی سے ڈر کر

اسے ڈھونڈنے نکلا"

نظم میرے اندر اُترتی چلی گئی

ماں۔۔۔

انسان کتنا تنہا ہو جاتا ہے۔۔۔؟

مجھے وہ دن یاد ہیں جب ہمارے گاؤں کی جنوبی سمت ٹیلوں پر رات گئے ڈاکو آنکلتے تھے اور ساری رات فائرنگ کی آواز گونجتی تھی۔ میرا دل کانپتا رہتا تھا۔ شام کی شفٹ رات دس بجے ختم ہوتی تھی۔

ایک روز میں نے کہا:

ابو مجھے ڈر آتا ہے۔۔۔

ہنسے اور کہا۔۔۔ دو بچوں کے باپ ہو گئے ہو اور ڈر لگتا ہے تم کو۔۔۔!

اگلی رات میں ڈیوٹی سے لوٹ رہا تھا۔ ریلوے کراسنگ پر ایک چھوٹا پل ہے، اس

کے آخری سرے پر ابو میرا انتظار کر رہے تھے۔ اور پھر جب بھی میری شام کی شفٹ ہوتی وہ مجھے لینے آ جاتے۔

اب خوف کا ایک لامتناہی صحرا ہے۔۔۔ اور میں اکیلا۔۔۔!

ماں۔۔۔

کیا برآمدے میں اب بھی ابو کا موٹر سائیکل کھڑا ہے۔۔۔؟

سائیڈ سٹینڈ پر موٹر سائیکل کھڑا کرنے سے ہمیشہ روکتے۔ ان کو اس بات کا ہمیشہ خیال رہتا کہ اگر اسامہ اور حفصہ نے موٹر سائیکل پر چڑھنے کی کوشش کی تو گر بھی سکتے ہیں۔

کیا برآمدے میں اب بھی ابو کا موٹر سائیکل کھڑا ہے۔۔۔؟

ماں۔۔۔ چوری چوری چلانے کو نکال نہ لے جاؤں۔۔۔؟ اگر ابو غصے ہوئے تو تم مجھے چھپا لینا۔ مائیں بھی تو خدا کی طرح اولاد کے عیوب پر پردہ ڈال دیتی ہیں۔

ماں۔۔۔ میرے ساتھ تمہیں کمرے کے اندر داخل ہونا ہوگا۔۔ ابو سے مجھے بہت سی باتیں کہنی ہیں۔ یہ وہی کمرہ ہے جس میں تمہاری سانس کی آواز مجھے پکارتی ہے۔ وہ دن میں کیسے بھول جاؤں۔۔۔؟ وہ لمحہ میرے ذہن کی تختی سے کیسے مٹ جائے جب اس کمرے کے باہر مرغیاں اپنا رزق تلاش کر رہی تھیں اور شیشم کے پتوں پر شام اتر رہی تھی۔ تمہارے سرہانے دوائیاں رکھی تھیں۔ اور صبح مجھے تمہیں لے کر ہسپتال جانا تھا۔

ماں۔۔۔

تمہیں ڈاکٹر نے ہسپتال Admit کر لیا اور جب میں گھر تمہارے لیے تکیہ، کمبل، چائے کا سامان اور دیگر اشیا لینے کے لیے آیا تو برآمدے میں کھڑے ہو کر میں نے اس کمرے کی جانب نگاہ کی۔ مجھے اس کمرے سے تمہارے لیے تکیہ اور کمبل اٹھانا تھا اور مجھے جانے کیوں یہ یقین ہو گیا کہ کمرہ بے روح ہو گیا ہے۔ اس میں تمہاری سانس نہیں تھی۔ اسی دن سے اپنا وجود گھسیٹنے لگا۔ میرے پاؤں نے میرے جسم کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا۔

کمرے کے اندر داخل ہونا میرے لیے اتنا مشکل کیوں ہو گیا ہے۔۔۔؟

لکڑی کی الماری میں ابو کی ''فیور لوبا'' گھڑی رکھی ہے۔

اور مزدور جانے کہاں گئے۔۔۔؟

ابو سے کون جا کہے۔۔۔

عہد ہی نہیں بدلا روایات بھی بدل گئی ہیں۔آج ہر کلائی پر گھڑی ہے اور انسان کے پاس اپنی ذات کے لیے وقت نہیں ہے۔وہ بھاگ رہا ہے۔ان آسائشات کے لیے جو اسے ذہنی کرب میں مبتلا کرتی ہیں وہ ان کو حاصل کر کے بھی خوشی کی تلاش میں حیران وسرگرداں وقت کی دیوار سے سر ٹکراتا ہے لیکن اس کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔آج کا پاگل انسان مادی آسائشات میں روح کا سکون تلاش کرتا ہے۔

ماں۔۔۔

تم نے بہت دیر کر دی۔۔۔

ابو اب موٹر سائیکل پر سوار ہونے کو ہیں۔سر پر قراقلی ٹوپی' واسکٹ' رے بین کی عینک' سرخ عربی رومال' ہاتھ میں چمڑے کا پرس جس میں کاغذات اور رے بین عینک کا کور ہے۔پہلے وہ کندیاں بازار جائیں گے۔ڈاکٹر عطاء سے بچوں کی دوائی لیں گے۔حاجی رانجھا صدیق کریانہ مرچنٹ سے گھر کا سودا سلف خریدیں گے' پھر اخبار کے مطالعہ کے لیے ڈاکٹر سبحان کے میڈیکل سٹور پر جائیں گے۔ایک ٹھنڈا گلاس پانی کا پئیں گے۔نعیم میڈیکل ہال پر جا کر ڈاکٹر مبارک کا ضرور معلوم کریں گے اور چائے کی رقم خود ادا کر کے ایک پیالی چائے پئیں گے۔ان کو پٹواری سے بھی ملنا ہے۔تحصیل دار کے پاس بھی کوئی کام اٹکا ہوگا۔ان کا سرگودھا کا بھی پروگرام ہو سکتا ہے۔

کمرے کی اندر کی دنیا کیسی ہوگی۔۔۔؟

میں اندر قدم کیسے دھروں۔۔۔؟

ماں مجھے ڈر نے آلیا ہے۔۔۔

ابو کے سرہانے دودھ کے کٹورے پر اخبار دھرا ہوگا۔

سوتے وقت باقاعدگی سے دودھ پینا ان کے معمولات میں شامل تھا۔

ماں۔۔۔

تمہارے جانے کے بعد چاند اور سورج کو ہی گہن نہیں لگا۔ پوری کائنات کو گہن لگ گیا ہے۔

تاریکی چھا گئی ہے۔

ہمیں تو اس گہن کی مدت ہی معلوم نہیں۔۔۔؟

ماں۔۔۔

اب تو گھر میں ٹھہریں تو خوف آتا ہے۔

باہر شیشم کی ٹہنیوں میں سید مبارک شاہ کی ایک مکمل ادھوری نظم روئی ہے۔

بتا اے ہم میں جینے کا سلیقہ بانٹنے والی

بھلا یہ بھی کوئی مرنے کا طریقہ تھا

کہ سونے کا بہانہ کرکے

خوابوں سے نکل جانا

تجھے نیند میں چلنے کی عادت بھی نہیں تھی ناں

تو پھر دوپہر میں سوتے ہوئے کیسے

تو اتنا دور جانکلی

جہاں تجھ تک صدائیں کیا

مرے سینے کا سناٹا نہیں جاتا

شبِ رخصت جو رُخصت ہو نہیں سکتی

ترے بچے

اسی شب کے شکنجوں میں تڑپتے رہ گئے لیکن

مری بے چین ماں تجھ کو

یہ کیسا چین آیا
کہ تو نے ایک کروٹ تک نہیں بدلی
تو کہتی تھی
خدایا میرے بچوں کو قیامت تک سلامت رکھ
تو پھر جاتے ہوئے گھر میں
قیامت کیوں نہیں دیکھی
ہماری بات چھوڑو ہم تو بچے ہیں
مگر ماں جب تری ماں نے
لرزتی آنکھ سے تجھ کو پکارا تو
فرشتہ رو پڑا تھا
ترے ٹھنڈے تبسم نے کوئی تیور نہیں بدلا
تری نظریں بدلنے کا وہ منظر رہ گیا لیکن
ہمارے گھر کے آنگن نے
ستمبر سے کوئی موسم نہیں بدلا
ستمبر تو
درختوں کی اجڑتی ٹہنیوں سے
زرد پتوں کے اترنے کا مہینہ تھا
مگر اب کے ستم بر نے
درخت منتہیٰ پر ہاتھ کیوں رکھا
ستم بر کیسے بولے گا
ستم گر سے کوئی پوچھو
برید شاخ بے جاں کی اذیت جاننے والے

کوئی زندہ درختوں پر بھی ایسے وار کرتا ہے

ہواؤں کے بدن میں زندگی بھرتے

پرندوں کے ٹھکانے قتل کرڈالے

بتا اے وقت کے خالق ترے ہوتے ہوئے کس نے

بس اک پل میں

میرے سارے زمانے قتل کرڈالے

ستم گر کیا بتائے گا

بتا اے ہم میں جینے کا سلیقہ بانٹنے والی بتا ہم کو

بھلا یہ بھی کوئی مرنے کا طریقہ تھا

مبارک شاہ کی نظم کسی اور ٹہنی پر جا بیٹھی ہے۔

ماں۔۔۔

تم اپنی یاد کے خیمے ساتھ لے جاتیں تو اچھا تھا

ان خیموں میں مکیں یادیں اداس رہتی ہیں

یہ یادیں دکھ کے چولہے پر آنسو ابالتی رہتی ہیں۔

ابو کمرے میں نہیں ہیں۔۔۔

چارپائی پر کون بیٹھا ہے۔ یہ سرہانے دوائیاں کس کی رکھی ہیں۔۔۔

میں نے لوہے کی الماری کو کیوں کھولا ہے۔ اسے بند رہنا چاہئے تھا۔

لیکن اسے کھولنا ضروری تھا

اس میں میری ماں کی خوشبو ہے۔۔۔

اس میں میری ماں کی اتنی یادیں ہیں جتنے میرے رب کریم نے آسمان پر تارے بنائے ہیں۔

کمرے میں مہک ہے

ماں۔۔۔

تمھارا تخت پوش اور اس پر بچھی جائے نماز اداس ہے۔

انگاروں پر دھری چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔

تونسہ شریف سے طاہرہ بی بی اب بھی آتی ہے۔ وہ تھوڑی دیر کو تمھارے کمرے میں ضرور آتی ہے۔ تم کو یاد کرتی ہے۔ تمھاری باتیں کرتی ہے۔ ماں۔۔۔ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ وہ اب بھی رمضان شریف میں تراویح کا باجماعت اہتمام کرتی ہے اور خواتین کو پورا قرآن سناتی ہے۔ اس کا کہنا ہے یہ سارا ثواب تمھارے نام فرشتے رقم کرتے ہیں کیوں کہ باجماعت تراویح کا آغاز تم نے کیا۔

انگاروں پر دھری چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔

ماں۔۔۔

میں نے ایک روز اپنے دوست پروفیسر عبدالباسط کو ایک خط لکھا۔

تمھارے کمرے میں بیٹھ کر۔۔۔

میں نے آنسو اس کو پارسل کر دیے

خنکی ہے

اور جس کمرے میں، میں موجود ہوں

اس۔۔۔ میں میری ماں کی خوشبو پھیلی ہے

عبدالباسط! مجھے تو گنتی اور شمار ہی یاد نہیں

کتنے برس گزر گئے؟

لوہے کی پرات ہے۔۔۔اور

رات ہے

انگاروں پر چائے دھری ہے

کمرے میں خوشبو ہے

ماں کی۔۔۔

قرآن کی۔۔۔

میری ماں کب نیند اوڑھتی تھی۔۔۔؟

جب اس نے نیند اوڑھی

رات ہو گئی

اور

اب ایک لمبی رات ہے

جس کی کوئی سحر ہی نہیں ہے۔۔۔

ماں۔۔۔

یہ خط مجھے اپنی زندگی کی طرح ادھورا لگتا ہے۔

اسی شب میں نے ایک خط ڈیرہ اسماعیل خان اپنے عہد کے نامور مصور عجب خان کو

لکھا:

میں نے اپنا دکھ جانے عجب خان کو کیوں پوسٹ کر دیا۔۔۔؟

اس کے اپنے مسائل، دکھ اور الجھنیں کیا کم ہوں گی۔

رات کا سمہ ہے۔

اور خنکی

آسمان پر تاروں کی چادر تنی ہے

اور میرے دل کی زمین پر

خوشبو ہے۔ ایکسیڈنٹ کے وقت یہی جوڑا انہوں نے پہن رکھا تھا۔

ان کا لباس دیکھ کر مجھے ایسے محسوس ہوا۔

ابھی وہ لوٹ کر یہ لباس پہن لیں گے۔ وہ یہیں کہیں آس پاس موجود ہیں۔

ان کی جوتی کا جوڑا ابھی محفوظ رکھا ہے۔

ہینڈ بیگ، عینک، گھڑی، واسکٹ، سرخ عربی رومال، جرابیں، Parker Pen اور عطر کی شیشیاں۔۔۔!

ماں۔۔۔

ساری یادیں میرے اندر رکھی ہیں اور مجھے ان کی تعداد بھی معلوم ہے تو میں پھر ان کو کیوں شمار کر رہا ہوں؟

یہ ساری تصویریں تو میرے اندر موجود ہیں اور عملِ انعکاس سے گزرتی رہتی ہیں۔

یادوں کے رنگ منعکس ہوتے رہتے ہیں۔

ایک عکس ذہن کے کینوس پر اپنے رنگ بھر رہا ہے۔

ماں۔۔۔

مجھے ٹیپ ریکارڈر لے دو۔

ایک ضد۔۔۔! بچپن کی ہٹ دھرمی۔

ابھی تو لوگوں کے گھر ریڈیو نہیں اور مجھے ٹیپ ریکارڈر چاہیے۔

ابو کا غصہ ابھی تک میرے اندر گونج رہا ہے۔

تم نے اپنے کانوں کے آویزے اور انگوٹھی بیچ دی۔

ٹیپ ریکارڈر آ گیا۔

ماں۔۔۔

اب میں نے کمپیوٹر بھی لے لیا ہے۔

دیکھو تو ماں کتنا خوبصورت ہے۔ ٹیپ پر تو میں صرف گانے سنتا تھا۔ استاد امانت علی

ماں۔۔۔

بچپن میں ابو نانا جان اور قاری غلام ربانی سے تختی لکھنے پر بہت مار جھیلی تھی۔

اب خوشخطی کا مسئلہ ہی نہیں ہے۔۔۔

میں کمپوزنگ خود کر رہا ہوں

طرزِ تحریر بدلنے کے کتنے ہی انداز ایک کلِک پر موجود ہیں۔

ماں۔۔۔

ایک عرصہ ہوا مجھے کمپیوٹر پر عادت سی ہو گئی ہے۔

خط لکھنا' پرنٹ نکالنا اور پوسٹ کر دینا۔

سہل انگار ہو گیا ہوں۔۔۔!

ایک دن مانسہرہ سے مجھے جانِ عالم کی ایک میل موصول ہوئی۔

اس نے مجھے جگا دیا۔

میں کمپیوٹر کی سکرین پر نظریں جمائے اس کی میل پڑھتا رہا۔

جانِ عالم کی تحریر' مانسہرہ کے سرد پہاڑوں سے گرم جوش تحریر' میرے سامنے ہے۔

''اور ہاں۔۔۔! آپ خود خط کیوں نہیں لکھتے' یہ آپ اچھا نہیں کرتے آپ کو پتا ہے کہ خط کے ساتھ لکھنے والے کا کچھ حصہ لپٹ جاتا ہے۔ وہ احساس' وہ لمس جو ذاتی تحریر میں ہوتا ہے' اس سے آپ دوسروں کو کیوں محروم رکھتے ہیں۔ خط خود لکھا کریں' کمپوزڈ خط کم از کم مجھے نہ لکھا کریں۔ ہاں ای میل الگ معاملہ ہے۔۔۔!''

ماں۔۔۔

بچپن میں ابو نانا جان اور قاری غلام ربانی سے تختی لکھنے پر بہت مار جھیلی تھی۔

جانِ عالم کی تحریر نے ہتھیلی پر پڑی توت کی چھڑی کی مار کے نشان تازہ کر دیے۔

مجھے تختی کی یاد آئی۔۔۔

گاچی' اور کانے کی بنی قلم کے ساتھ نانا جان یاد آئے اور میں نے پھر قلم سنبھال لیا۔

اب میں دوستوں کو کمپوزڈ خط نہیں لکھتا۔

ماں۔۔۔

ایک اور عکس ذہن کے کینوس پر اپنے رنگ بھر رہا ہے۔

جب میں نے سات سال کی عمر میں قرآن مجید ختم کیا تو طلباء ساتھیوں نے فِرنی کھانے کی فرمائش کی۔قریباً ایک سو تعداد ہو گی طلباء کی۔اس عہد میں تو مہمانوں کی آمد پر بھی کم کم گھر میں فرنی بنائی جاتی تھی۔سب رشتہ دار متفکر تھے کہ اتنے طلباء کے لیے فرنی کا اہتمام کیسے ہوگا۔۔۔؟

ماں تم نے یہ کر دکھایا

جنوبی قصبے ڈِنگ اور کھولہ سے تم نے دودھ منگوایا

میں اپنے بیٹے کی ہر خواہش پوری کروں گی

فرنی بن گئی

اور سب انگشت بدنداں رہ گئے

اور باہر شرینہہ کی چھاؤں تلے محمد یار عاصی پریشان ہو رہا تھا۔

یار۔۔یہ تم نے ہمیں روک کیوں لیا۔چائے کی ضرورت کیا تھی۔۔۔؟پانی پلا دیا ہے تم نے یہی بہت ہے۔اس کے بعد کسی تکلیف کی ضرورت نہیں۔ابھی ہم گفتگو کر ہی رہے تھے اور محمد یار عاصی سوچ کے ٹیلے پر پریشان بیٹھے تھے کہ پیلے رنگ کی ایک بڑی تام چینی کی کیتلی میں چائے اور لکڑی کے ایک کشادہ ٹرے میں پیالیاں سج کر آگئیں۔

ٹرے میں سوجی کا حلوہ اور چائے'مہمان نوازی' دریا دلی۔۔۔!

یہ ماں کی مٹھاس تھی۔

یہ تم تھیں ماں

بے سلوٹ پیشانی کے ساتھ تم نے مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔

میں اپنے بیٹے کی ہر خواہش پوری کروں گی

ماں۔۔۔

میں شگفتہ کے سوا اور کسی سے شادی نہیں کروں گا۔

بیٹا۔۔۔ سرگانہ خاندان بہت بڑا ہے۔ ہم درویش لوگ کیسے رشتہ مانگ سکتے ہیں؟

مجھے نہیں معلوم۔۔۔ ماں مجھے شگفتہ چاہیے۔

دماغ تو نہیں گھوم گیا تمہارا۔۔۔؟

ماں۔۔۔ تم رشتہ تو مانگ کر دیکھو

تم یہ کام اتنا آسان سمجھتے ہو۔۔۔؟

دس سال ماں، دعا اور دوا کرتی رہی

ماں کی دعا ہمیشہ ثمر بار ہوتی ہے

میں اپنے بیٹے کی ہر خواہش پوری کروں گی۔۔۔

ماں۔۔۔

سورج اب بھی طلوع ہوتا ہے

بچے آنگن میں شور مچاتے ہیں۔۔۔

اسماء سرِ شام بچوں سمیت آنکلتی ہے

اس کے چہرے پر اداسی نے جالا بن دیا ہے

ہم تینوں بہن بھائی جدا ہو گئے

میں اپنی ذات کے گنبد میں بند ہوں

میمونہ کویت چلی گئی

اسماء نے زندہ رہنے کے لیے اپنے آپ کو پورے کا پورا گھر اور بچوں میں گم کر دیا

میں کبھی کبھار برآمدے میں بیٹھ کر ان دیوار و در میں تمہیں تلاش کرتا ہوں، جہاں اب بھی تم موجود ہو۔۔۔!

آنسو کہیں روٹھ جاتے ہیں اور منانے پر بھی واپس پلٹ کر میری خبر نہیں لیتے۔

ماں۔۔۔

تم کہاں چلی گئی ہو۔۔۔؟
میں تمہارے سینے پر سر رکھ کر ایک بار کھل کے رونا چاہتا ہوں
ماں چلی جاتی ہے تو گھر کے دیوار و در ساتھ نہیں لے جاتی
وہ موجود رہتے ہیں
گھر کی ایک ایک اینٹ میں ماں کی یاد موجود ہوتی ہے
دیواریں بولتی ہیں
دروازے پکارتے ہیں
راستے
جن سے ماں گزرتی تھی
بین کرتے ہیں
پوری زمین ماں کی لحد میں بدل جاتی ہے۔
آنسو کہیں روٹھ جاتے ہیں اور منانے پر بھی واپس پلٹ کر میری خبر نہیں لیتے۔

***

ماں ۔۔۔

آنکھ کے خشک جزیروں میں تیری یاد کی کشتیاں لے کر گھر سے نکلتا ہوں۔

کندیاں بازار میں وہ کلاتھ ڈپو اب بھی موجود ہے، جہاں تم مدرسے کی بچیوں کے لیے سستے داموں کپڑے خریدنے جایا کرتی تھیں۔ ڈپو کی دہلیز پر بوڑھا دکاندار ناک کی نوک پر عینک جمائے اب بھی جماہیاں لیتا نظر آتا ہے۔ اس کا بیٹا کسی سودی دھندے میں پھنس کر باپ کی عمر بھر کی پونجی لے ڈوبا۔ ناتواں ہڈیوں کو جمع کر کے اس بوڑھے نے ہمت کی اور پھر کاروبار چل نکلا ہے۔

میانوالی اکبر کی دکان پر اب بھی عورتوں کا جمگھٹا رہتا ہے لیکن ان میں تم نہیں ہو۔

بلوچ کلاتھ ہاؤس پر کپڑے کے نت نئے تھان کھلتے ہیں۔ بلبوں کی تیز روشنی میں دکاندار تھان کھول کھول کر خواتین کے سامنے پھیلاتا ہے۔

ان میں میری ماں نہیں ہے\
تم کہاں چلی گئی ہو۔۔۔؟\
میں تمہارے سینے پر سر رکھ کر ایک بار کھل کے رونا چاہتا ہوں\
ماں چلی جاتی ہے تو گھر کے دیوار و در ساتھ نہیں لے جاتی\
وہ موجود رہتے ہیں\
گھر کی ایک ایک اینٹ میں ماں کی یاد موجود ہوتی ہے\
دیواریں بولتی ہیں\
دروازے پکارتے ہیں

راستے

جن سے ماں گزرتی تھی

بین کرتے ہیں

پوری زمین ماں کی لحد میں بدل جاتی ہے۔

تم کہاں چلی گئی ہو۔۔۔؟

میں جب بھی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتا ہوں

ایک آواز میری سماعت پر دستک دے کر مجھے حیران چھوڑ جاتی ہے

بیٹا۔۔۔میں بائیں جانب بیٹھوں گی۔ میرے دل میں درد ہوتا ہے۔ کار آہستہ چلانا

ماں۔۔۔

تمہیں ساری عمر دل کی تکلیف رہی

لیکن زندگی تم نے دوا کھائے بغیر گزار لی

ڈاکٹر محمد انور کنور ہمیشہ مجھے بلا کر کہتے

ہاں۔۔۔جوان تمہاری امی Dejoxen لے رہی ہیں

ڈاکٹر صاحب۔۔۔امی میرے کہنے پر میڈیسن نہیں لیتیں

ان کی زندگی کے لیے میڈیسن ضروری ہے

ماں۔۔۔

ابھی گزشتہ دنوں میری ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی۔

انہوں نے مجھے وہ تمام سویٹر دکھائے جو تم نے ان کو بُن کر دیے تھے۔ آنٹی اور ڈاکٹر صاحب آج بھی تمہیں اپنائیت اور محبت سے یاد کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے اس عہد میں اب اتنی محنت کون کرتا ہے۔ مارکیٹ میں ایک سے ایک قیمتی سویٹر موجود ہے۔ اب ایسی چیزیں نایاب ہوگئی ہیں۔ میں نے تو تمہاری امی کے ہاتھ کی سویٹریں سنبھال کر رکھی ہوئی ہیں۔ سردیوں میں وہی پہنتا ہوں۔

ماں۔۔۔

ڈاکٹر صاحب اب بھی ہم سب کو اپنے بچوں کی طرح پیار کرتے ہیں۔ وقت بے وقت جب بھی ان کو تکلیف دی جائے ان کی پیشانی پر سلوٹ نہیں آتی۔ میری پوری بستی، علاقہ، ضلع میانوالی اور آس پاس کے اضلاع بھی ان کی مسیحائی سے فیض یاب ہوتے ہیں۔

ایک آواز میری سماعت پر دستک دے کر مجھے حیران چھوڑ جاتی ہے۔

بیٹا۔۔۔ میں بائیں جانب بیٹھوں گی۔ میرے دل میں درد ہوتا ہے۔ کار آہستہ چلانا

ماں تم نے کتنے بہت سے کام سنبھال رکھے تھے

قاری مفتاح الاسلام کے پورے گھرانے کی دیکھ بھال تم نے اپنے فرائض میں شامل کر لی تھی۔

مدرسے میں اب بھی قرآن کی تعلیم قاری مفتاح الاسلام کے ذمہ ہے۔

راستہ وہی لیکن تم نہیں ہو

تمہارے بعد آنگن سونا ہو گیا

مدرسے کی بچیاں یوں بکھر گئیں جیسے خزاں کے موسم میں درختوں کی ٹہنیوں پر سے پتے بکھر جاتے ہیں۔۔۔!

میں آنگن میں بیٹھا عہدِ رفتہ کو آواز دیتا ہوں

میری آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوتی ہے

دادی ماں چھپر تلے بیٹھی ناشتہ بنا رہی ہے

تم صحن میں سرد دھوپ اوڑھے سویٹر بننے میں مصروف ہو

ابو موٹر سائیکل پر کندیاں گئے ہیں

اسماء گھر کی صفائی میں مگن ہے

میمونہ سورج نکل آنے پر بھی سو رہی ہے

اجازت ہو تو اس پر بہت سے لحاف ڈال دوں۔۔۔؟

لیکن دادی اماں غصے ہوں گی

لیکن ماں میری بہن تو کویت میں ہے

اب نہ تو وہ کوئی سندیسہ بھیجتی ہے اور نہ ہی بچپن کی گم شدہ مسکراہٹ۔۔۔!

کبھی کبھار انٹرنیٹ پر Voice Chat ہو تو کہتی ہے

بھائی۔۔۔میں کسی کے لیے اُداس نہیں ہوتی

جھوٹ کہتی ہے ماں۔۔۔

پارسال جب وطن لوٹی تھی تو ایک دن گھر کے برآمدے میں بیٹھے بیٹھے رو کیوں دی تھی۔۔۔؟

ماں۔۔۔

درد انسان کے اندر گُرلاتے رہتے ہیں

تمہارے جانے کے بعد جب اس نے کویت کا ارادہ باندھ کر اس پر عمل کر دکھایا تو میں نے اسے خاموشی سے الوداع کہا۔۔۔پھر بندھن ٹوٹ گئے۔

لیکن یہ بندھن میرے اپنے ہیں

میں ان کو خود باندھ اور توڑ لیتا ہوں

ماں۔۔۔

تم کہاں چلی گئی ہو۔۔۔؟

تمہارے ساتھ ہی سارے ذائقے چلے گئے

گھر میں اب بھی سالن کی تیز خوشبو پھیلتی ہے۔سالن میں ادرک، لہسن، ہلدی، پودینہ ریحان اور گرم مسالہ اب بھی ڈالا جاتا ہے لیکن اس میں تمہارے ہاتھ کا ذائقہ نہیں ہے۔

ذائقے کہاں کھو گئے۔۔۔؟

ماں۔۔۔

آج بھی بابا مؤذن کی آواز اسی طرح مسلمانوں کو فلاح کی طرف پکارتی ہے جیسے

چودہ سو سال پہلے حضرت بلال حبشیؓ کی آواز پکارا کرتی تھی۔ بابا عزیز نے رختِ سفر باندھا اور آخرت کو جا گھر کیا۔ اس کی جگہ کوئی اور مؤذن اپنا فرض نبھا رہا ہے۔

مغرب کی اذان اب بھی لالہ حاکم دیتا ہے۔

بابا جی سارا سال ختمِ نبوت کے سفر میں رہتے ہیں۔

امامہ، حفصہ، اُسامہ اور قدامہ سکول جاتے ہیں۔

اسامہ نے قرآن کے بائیس پارے حفظ کر لیے ہیں۔

قاری مفتاح الاسلام امامت کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ ان کی بیٹیاں قبرستان کو جاتی اور تمھیں تلاش کرتی ہیں۔ قاری صاحب اس سال حج پر گئے تو ان کی بیٹی حفصہ اللہ کو پیاری ہو گئی۔ مجھے یاد ہے حفصہ بہت مہینوں تک قبرستان تمہاری تلاش میں جاتی رہی۔

جب اس سے کوئی سوال کرتا۔

حفصہ۔۔۔ کہاں گئی تھی۔۔۔؟

دادو کے پاس گئی تھی۔ اسے تم سے پیار نہیں عشق تھا۔

اور پھر ایک دن وہ سچ مچ تمہارے پاس پہنچ گئی۔

ماں۔۔۔

کتنے گھر تمہارے جانے سے ویران ہوئے۔

ایک گھر آباد رہتا ہے' اللہ کا گھر۔۔۔!

رمضان المبارک کے مہینے میں اب بھی ہماری خانقاہ سراجیہ کی مسجد میں پوری رات تراویح کا معمول ہے۔ سحری کے وقت گھر سے سینکڑوں درویشوں کے لیے جب سحری جاتی ہے تو تمہارے کمرے سے آواز آتی ہے۔۔۔ اور لقمہ میرے حلق میں اٹک جاتا ہے۔

عبدالباسط۔۔۔ میرے دوست

لقمہ میرے حلق میں اٹک جاتا ہے

ماں۔۔۔ لوہے کی ایک پرات میں انگارے لے آیا کرتی تھی

روزہ افطار کرتی تھی۔

انگاروں پر چائے دھری رہتی تھی

ساتھ تخت پوش پر قرآن اور تسبیح اس کے منتظر رہتے تھے۔

مجھے نہیں معلوم

میری ماں کب نیند اوڑھتی تھی

وہ نیند کیسے اوڑھ سکتی تھی۔۔۔؟

تہجد اس کا بچھونا تھا

اور قرآن اس کا غم گسار

اس کا ایک ہی سہارا تھا۔۔۔

اللہ۔۔۔!

وہ کیسے نیند اوڑھ سکتی تھی۔۔۔؟

وہ شب بھر اپنے سہارے سے ہم کلام رہتی تھی۔

شاید

وہ جاگتے میں نیند اوڑھ لیتی تھی

عبدالباسط۔۔۔تم نے پوچھا ہے

میں تم کو کیسے بتاؤں۔۔۔؟

جب اس نے نیند اوڑھی۔۔۔ستارے سو گئے

چاند ڈوب گیا

اور دور کہیں سے آواز آئی

آنسو کی آواز

دو آنسو۔۔۔اور چپ۔۔۔!

***

اور پھر خاموشی چھا گئی۔

ماں چلی جائے تو سناٹے بولتے ہیں۔

جس روز بشارت احمد کی ماں نے رختِ سفر باندھا

اس روز میرے اندر ایک بار پھر تنہائی اپنی پوری توانائی سے کُرلائی اور میرے اندر درد کا شیشہ ٹوٹا۔

ہمدردی کے سارے لفظ پرندے زبان کی ڈالی سے اڑ گئے اور میں اپنے دوست کے دل کی کیاری میں تسلی کا ایک ننھا سا پودا بھی نہ لگا سکا۔

گھر سونا کر جاتی ہیں مائیں کیوں مر جاتی ہیں
سبز دعاؤں کی کونجیں کیوں ہجرت کر جاتی ہیں

بشارت احمد کے کمرے میں بھی اس کی ماں کی چارپائی تھی، ویسے ہی جیسے میری ماں کی میرے کمرے میں۔۔۔!

بشارت احمد کے کمرے میں چارپائی اکیلی اور کائنات میں وہ اکیلا رہ گیا۔

ماں۔۔۔

بشارت احمد اب بھی باقاعدگی سے ہر اتوار کو میرے گھر آتا ہے

اس کا کمرہ خالی ہے، میرے دل کی مانند

وہ اپنی اداسی کسی کے ساتھ نہیں بانٹتا

وہ اپنے حصے کے غم سنبھال کر رکھتا ہے۔

ایک روز جب رات قدرے خنک تھی۔ وہ اکیلا تھا۔

میری اس سے ملاقات ہوئی۔

میں نے دیکھا کہ امجد اسلام امجد کی ایک نظم اس کی آنکھ سے ہتھیلی پر اُتری ہے۔

میں نے سوچا۔

وہ اپنے حصے کے غم سنبھال کر رکھتا ہے۔

کہ جب اس کی ساعتِ آخری سرِ راہ تھی

میں وہاں نہ تھا!

مرے راستوں سے نکل گئی وہ جو ایک جائے پناہ تھی

میں وہاں نہ تھا

سرِ شامِ غم مجھے ڈھونڈتی مری ماں کی بجھتی نگاہ تھی

میں وہاں نہ تھا!

مرے چار سو ہے دھواں دھواں

مرے خواب سے میری آنکھ تک

یہ جو سیلِ اشک ہے درمیاں

اسی سیلِ اشک کے پار ہے کہیں مری ماں!

ترے رحم کی نہیں حد کوئی، ترے عفو کی نہیں انتہا

کہ تو ماں سے بڑھ کر شفیق ہے

وہ رفیق ہے

کہ جو ساتھ ہو تو یہ زندگی کی مسافتیں

یہ اذیتیں ۔۔۔ یہ رکاوٹیں، فقط اک نگاہ کی مار ہیں

یہ جو خار ہیں، ترے دستِ معجزہ ساز سے

گُل خوش جمال بہار ہیں

مری التجا ہے تو بس یہی

مری زندگی کا جو وقت ہے، کٹے اس کی اُجلی دعاؤں میں

ترے در گزر کے حضور میں

تری برکتوں کے حصار میں

وہ جو خاص چشمِ کرم میں ہے

اسی روشنی کی قطار میں!
کسی چیز کی بھی کمی نہیں
تری بخششوں کے دیار میں!
مری ماں کی روحِ جمیل کو
سدا رکھنا اپنے جوار میں!
سدا پرفضا وہ لحد رہے
ترے لطفِ خاص کی چھاؤں میں

***

ماں۔۔۔

ایک روز اس ادھوری زندگی میں جمیل اختر نامی ایک شخص آنکلا۔

وہ میرے کتب خانے میں میرے سامنے بیٹھا تھا۔اس نے میری زندگی کی یہ ادھوری تحریر اُٹھا کر اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔اسے کتاب کی خوشبو میرے گھر تک کھینچ لائی۔

یہ دوست تمہارے سفرِ آخرت کے چند دن بعد میری زندگی کے دھارے میں شامل ہوا۔ دستر خوان کھلا تھا۔

جمیل اختر آئے اور محمد یار عاصی کے دستر خواں میں شامل ہو گئے۔

میں نے ان سے کہا۔اس گھر میں اترنے والا ہر دوست مری ماں کا مہمان ہوتا ہے۔

ماں چلی گئی۔

لیکن مہمان نوازی میرے گھر کی دہلیز پر احباب کا استقبال کرتی ہے۔

اور وہ اس کی خوشبو ساتھ لے کر جاتا ہے۔

جمیل اختر' بذلہ سنج' ہنس مکھ' ملنسار اور محفل کو کشتِ زعفران بنانے والا' اس علاقے میں ماں! کوریا کے تعاون سے واپڈا نے چشمہ بیراج پر ایک 180Mega Watt ہائیڈرو پاور پلانٹ لگایا گیا ہے۔اس میں وہ ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز ہے۔پنڈی گھیب کے پوٹوہاری علاقوں کا باسی یہاں صحرا میں آ مقیم ہوا ہے۔اس کی شریکِ سفر روبینہ جمیل بھی اسی کی طرح ہنس مکھ اور ملنسار ہے۔

دونوں نے یہ سمجھا کہ ہمارے گھر کا یہ رکھ رکھاؤ' محبت' اپنائیت' ملنساری اور مہمان نوازی ہم دونوں میاں بیوی کے دم سے ہے۔

ایک روز میں نے ان سے کہا:

ہم تو پرتو ہیں

عکس ہیں کسی کا۔۔۔

پسِ آئینہ کوئی اور ہے۔

یہ وہ دستر خوان ہے جسے میری ماں نے ساٹھ آدمیوں کے لیے بچھایا تھا۔اس کے بعد اس کو لپیٹا نہیں گیا۔ یہ کھلا ہے اور بچھا ہے۔ربِ کریم اسے ہمیشہ کھلا رکھے۔

یہ میری ماں کی یاد ہے۔

یہ زندہ رہے گی۔۔۔دھڑکتی اور سانس لیتی رہے گی۔

جمیل اختر میرے کتب خانے میں میرے سامنے بیٹھے تھے۔انہوں نے میری زندگی کی یہ ادھوری تحریر اٹھا کر اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔ان کا انہماک قابلِ دید تھا۔ بھابھی روبینہ ساتھ بیٹھی تھیں۔ بچے کھیل رہے تھے۔

میری شریکِ سفر نے کھانا چن دیا۔

جمیل اختر تحریر میں گم تھے۔

انہوں نے ایک ورق پلٹا۔۔۔ دوسرا اور تیسرا

اچانک ان کی آنکھوں سے ساون برسنے لگا۔وہ بچوں کی مانند بلک کر روئے۔

سارے گھر والے پہلے حیران اور پھر پریشان ہوئے۔

یہ جمیل بھائی کو اچانک کیا ہوا۔۔۔؟

میں بہت دیر اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر سہلاتا رہا۔

بہت مشکل کام ہے اس تحریر کا مطالعہ۔۔۔جانے آپ لکھ کیسے رہے ہیں۔۔۔؟

وہ اپنے آنسو میرے کتب خانے میں چھوڑ کر خود چلے گئے۔

پانی پر لکھی تحریر پڑھنے میں بہت دن مجھے اپنے وجود سے الگ ہونا پڑا۔

میں بھٹکتا رہا۔

❋❋❋

ماں۔۔۔

سورج اب بھی طلوع ہوتا ہے
بچے آنگن میں شور مچاتے ہیں۔۔۔
اسماء سرِ شام بچوں سمیت آنکلتی ہے
میں صحن میں بیٹھ کر تمہاری واپسی کا انتظار کھینچتا ہوں
عبث انتظار
میرے آنگن سے مسجد کے عظیم الشان گنبد میری باطنی کیفیت کے عکاس مجھ سے سوال کرتے رہتے ہیں
میرے پاس کسی سوال کا کوئی جواب نہیں
مسجد کی مغربی سمت حاشیے پر مولوی قاسم اب بھی بچوں کو درسِ حدیث دیتا ہے
لنگر خانے کے سامنے برآمدے میں بیٹھا موذن بابا عزیز کہولت کا عصا تھامے دن بھر کھانستا رہتا تھا۔ اب وہ بھی نہیں ہے۔ محمود خان درویش اپنی اپاہج ٹانگ گھسیٹتا مسجد کے ایک کونے میں بیٹھا تلاوت کرتا رہتا ہے۔ مسجد کے سامنے طلبا نمازِ عصر کے بعد والی بال کھیلتے رہتے ہیں۔
نہر کے پتن پر شیر محمد جوائے خیل اپنی بھینسوں کو ہانک لاتا ہے۔ ان کو نہلاتا‘ پانی پلاتا شام ڈھلے لوٹ جاتا ہے۔ ارائیوں والی ہٹی پر بشیر ارائیں اور اس کے بھائی میکانکی انداز میں کام کرتے نظر آتے ہیں۔
نہر کی پلی پر برسوں تک بشیر ارائیں اپنی ہٹی کا بے تاج بادشاہ رہا۔

ماں۔۔۔

اب پلی پر ایک شہر اُبھر آیا ہے۔
پنکچر لگانے والا' کھل بنولہ کی الگ دکان' نائی' درزی' موچی' کئی کریانہ سٹور' دو ہوٹل اوران ہوٹلوں سے اُونچی آواز میں نکلتی سمع خراش موسیقی کی آواز' بلیرڈ' ریڈیو میکینک' کھاد ڈیلر' جوگی قصائی اور موٹر سائیکل میکینک کی دکان سے نکلتی موٹر سائیکلوں کی بے ہنگم آوازیں۔
دو سے کا کھوکھا اسی جگہ نہر کنارے شیشم کے درختوں کے درمیان رکھا ہے۔ وہ صبح سویرے سائیکل پر کندیاں سودا سلف لینے کو جاتا ہے۔

ماں۔۔۔

ساری یادیں میرے اندر رکھی ہیں
یہ ساری تصویریں میرے اندر موجود ہیں اور عملِ انعکاس سے گزرتی رہتی ہیں۔
یادوں کے رنگ منعکس ہوتے رہتے ہیں
ایک عکس ذہن کے کینوس پر اپنے رنگ بھر رہا ہے۔
ایک گرم دوپہر کی یاد
جب تم نے میرے چہرے پر لکھی تحریر پڑھ لی
بیٹا۔۔۔ کیوں پریشان ہو۔۔۔؟
نہیں ماں' میں تو ٹھیک ہوں
ماں سے جھوٹ بولتے ہو

ماں۔۔۔

اتنا یاد تو نہ آیا کرو
میرا وجود ٹکڑوں میں بٹ جاتا ہے۔
مجھے اپنے ٹکرے خود ہی چننے اور جوڑنے ہوتے ہیں

کوئی ٹکڑا اپنی جگہ نہ بیٹھے تو اندر کوئی روتا ہے۔ باہر کوئی ہنستا ہے
ان اندر باہر کے موسموں نے مجھے کھوکھلا کر دیا ہے۔
ماں جھوٹ نہیں بول رہا
تمہیں کچھ چاہیے۔۔۔؟
ماں۔۔۔تحریر رک گئی ہے
مجھے ایک بار کھل کے رو لینے دے
مجھ سے کمپوزنگ نہیں ہو رہی ہے
ایک گرم دوپہر کی یاد
جب تم نے میرے چہرے پر لکھی تحریر پڑھ لی
میری خاموشی
تم نے شگفتہ کو آواز دی
بیٹا۔۔۔اسے کیا چاہیے؟
خالہ مجھے تو نہیں معلوم
زمین کا کہتا ہے تو اس کے نام کر دوں
نہیں خالہ
ماں تم نے مجھے پھر بلایا اور سوال کیا
نہیں ماں۔۔۔ مجھے زمین نہیں چاہیے۔ زمین میری ضرورت اور مسئلہ ہی نہیں ہے۔ زمین ہماری نہیں ہم زمین کی ملکیت ہوتے ہیں۔ میرے ربِ کریم نے مجھے دولت اور زمین کی ہوس سے محفوظ رکھا ہے۔ میری ہر سانس قیامت تک سربہ سجود رہے تو بھی قناعت کی اس نعمت کا شکریہ ادا نہیں ہو سکتا۔
تو پھر تمہیں اور کیا چاہیے۔۔۔؟
مجھے ''دعا'' چاہیے

ماں مسکرائی۔۔۔

میری تو ہر سانس دُعا ہے

ماں۔۔۔ایسے ہے نا۔۔۔! دعا تسلسل میں رہے۔ دعا کا انقطاع کبھی نہ ہو

جھلأ نہ ہووے تو۔۔۔دل کی بات بتا

ماں۔۔۔تمہارے پاس جو حجۃ الاسلام شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کا مترجم قرآن ہے جس کی تفسیر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے لکھی ہے، اس پر ایک دعا لکھ کر مجھے دے دو۔ مجھے زندگی میں یہی سوغات بہت ہے۔ یہی میری زمین ہے، یہی میرا سرمایہ۔۔۔!

تم نے تفسیر اٹھا کر لانے کو کہا:

دعا لکھی:

"۷۸۶۔۔۔پیارے بیٹے حامد کے لیے

خداوندِ کریم میرے بچوں کو کلام پاک پڑھنے اور اس پر عمل

کی توفیق اور شوق عطا فرمائے۔

والدہ محمد حامد

۲۴ رمضان المبارک

23 جنوری 1998ء جمعتہ المبارک"

ماں۔۔۔

یہ دعا تو ان لمحوں کی امین ہے جب ابھی کینسر نے دستک نہیں دی تھی

میں نے تم سے دعا کا کیوں کہا؟

میرا اندر بہت پہلے خالی ہونا شروع ہو چکا تھا

خوشیاں اور مسکراہٹیں اپنا سامان باندھ رہی تھیں

ماں تمہارے جانے کے بعد کائنات بے روح ہو گئی ہے۔ چہرے ساکت، آسمان چپ، ستارے بے نور، سورج زرد، شجر خزاں رسیدہ اور ہوائیں نوحے رقم کرتی اور کرلاتی رہتی

میرا سانحہ بڑا ہے
مرا درد لا دوا ہے
مرے سر سے دوپہر میں
تری چھاں چلی گئی ہے
اے خدائے زندگانی
مری ماں چلی گئی ہے

ماں۔۔۔

یہ شام اداسی اور تنہائی کا لامتناہی صحرا
تم وقت کی قید سے ورے جا آباد ہوئیں۔
اور میں۔۔۔
ہجر کے پیڑ تلے بیٹھا اپنی باری کا انتظار کر رہا ہوں۔

***

محمد حامد سراج کی کتب

وقت کی فصیل (افسانوی مجموعہ)

میّا (ماں کے موضوع پر اُردو ادب کا طویل ترین خاکہ)

برائے فروخت (افسانوی مجموعہ)

چوب دار (افسانوی مجموعہ)

آشوب گاہ (ناولٹ)

بخیہ گری (افسانوی مجموعہ)

ہمارے بابا جی (حضرت خواجہ مولانا خان محمد رحمۃ اللہ علیہ)

مجموعہ محمد حامد سراج

عالمی ادیبوں کے شاہکار افسانے (مرتب)

ایک محبت سو افسانے (مرتب)

دہلی کے افسانے

بیگمات کے آنسو

مصنف:

خواجہ حسن نظامی

مرتبہ:

سید اشرف حسین رضوی

پیش لفظ:

محمد حامد سراج

بُک کارنر

شوروم: بالمقابل اقبال لائبریری بک سٹریٹ جہلم پاکستان

پرنٹرز۔ پبلشرز۔ کمپوزرز۔ ڈیزائنرز۔ بک سیلرز۔ ہول سیلرز اینڈ لائبریری آرڈر سپلائیرز

مشاہیر کی آپ بیتیاں

سرسید احمد خان

ڈپٹی نذیر احمد

پریم چند

سرور الملک آغا مرزا دہلوی

مرتب

عظیم الشان صدیقی

ناشران

بُک کارنر

شوروم: بالمقابل اقبال لائبریری بک سٹریٹ جہلم پاکستان

فون نمبر 0544-614977 موبائل 0323-5777931

پرنٹرز۔ پبلشرز۔ کمپوزرز۔ ڈیزائنرز۔ بک سیلرز۔ ہول سیلرز اینڈ لائبریری آرڈر سپلائیرز

خوبصورت اور معیاری کتابیں

ان کتابوں کے بغیر آپ کی لائبریری نامکمل ہے!

کتاب	مصنف
عمر خیام	سید سلیمان ندوی
امیر خسرو	صباح الدین عبدالرحمٰن
اورنگ زیب عالمگیر	رئیس احمد جعفری
غازی علم الدین شہید رحمۃ اللہ علیہ	عبدالرشید عراقی
حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ	انجم سلطان شہباز
حضرت میاں محمد بخش رحمۃ اللہ علیہ	پروفیسر حمید اللہ شاہ ہاشمی
حضرت سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ	پروفیسر حمید اللہ شاہ ہاشمی
حضرت بابا بلھے شاہ رحمۃ اللہ علیہ	پروفیسر حمید اللہ شاہ ہاشمی
عماد الدین زنگی	صادق حسین صدیقی
محمد بن قاسم	صادق حسین صدیقی
طارق بن زیاد	صادق حسین صدیقی
سلطان محمود غزنوی	صادق حسین صدیقی
سلطان شہاب الدین غوری	صادق حسین صدیقی
سلطان بایزید یلدرم	صادق حسین صدیقی
سلطان سبکتگین	صادق حسین صدیقی
سلطان غیاث الدین	صادق حسین صدیقی
سراج الدولہ	صادق حسین صدیقی
صلاح الدین ایوبی	ہیرلڈلیم
امیر تیمور	ہیرلڈلیم
چنگیز خان	ہیرلڈلیم
سقراط	کوراہیس
حیدر علی	پروفیسر این کے سنہا
مہاراجہ رنجیت سنگھ	پروفیسر این کے سنہا
شیر شاہ سوری	انجم سلطان شہباز
سکندر اعظم	انجم سلطان شہباز

کتاب	مصنف
اقوامِ پاکستان کا انسائیکلوپیڈیا	انجم سلطان شہباز
تذکرہ اولیائے جہلم	انجم سلطان شہباز
تاریخ جہلم	انجم سلطان شہباز
شخصیاتِ جہلم	انجم سلطان شہباز
تاریخ ابن خلدون (تلخیص)	انجم سلطان شہباز
تاریخ ارض القرآن	سید سلیمان ندوی
یادگار شخصیات	جواہر لعل نہرو
دُنیا کے بڑے مذاہب	عماد الحسن آزاد فاروقی
خدا کے لیے جنگ	کیرن آرمسٹرانگ
غم نہ کریں!	ڈاکٹر عائض القرنی
رازِ حیات	مولانا وحید الدین خان
انسان کی منزل	مولانا وحید الدین خان
تعمیرِ انسانیت	مولانا وحید الدین خان
تعمیرِ حیات	مولانا وحید الدین خان
کتابِ زندگی	مولانا وحید الدین خان
پریشان ہونا چھوڑیے جینا سیکھیے!	ڈیل کارنیگی
میٹھے بول میں جادو ہے	ڈیل کارنیگی
گفتگو تقریر ایک فن	ڈیل کارنیگی
39 بڑے آدمی	ڈیل کارنیگی
کامیاب لوگوں کی دلچسپ باتیں	ڈیل کارنیگی
مانیں نہ مانیں	ڈیل کارنیگی
کلیاتِ ڈیل کارنیگی	ڈیل کارنیگی
فرمانِ الٰہی	الحاج محمد زمان
ذکر اللہ والوں کے	محمد فیروز
یہ تیرے پر اسرار بندے	سید ذیشان نظامی

ناشران: بک کارنر شوروم بالمقابل اقبال لائبریری بک سٹریٹ جہلم پاکستان

خوبصورت اور معیاری کتابیں

ان کتابوں کے بغیر آپ کی لائبریری نامکمل ہے!

کتاب	مصنف
برجوں کی نایاب کتاب	ابو معشر بلخی فلکی
سو عظیم سائنسی دریافتیں	ملک محمد شاہد اقبال
ایجادات کی تاریخ	ایگن لارسن
ڈرائیونگ خود سیکھیے!	انجم سلطان شہباز
بچوں کا علمی انسائیکلوپیڈیا	کامران اعظم
بچوں کے لیے سیرۃ النبی ﷺ	پروفیسر حمید اللہ ہاشمی
حاتم طائی کی کہانیاں	نور الحسن نقوی
چار درویش چار کہانیاں	میر امن دہلوی
نورتن کہانیاں	محمد بخش مہجور
انوار سہیلی کی کہانیاں	ملا حسین واعظ کاشفی
دی جنگل بک	مولانا ظفر علی خان
بچوں کی نظمیں اور پہیلیاں	فراغ روہوی
آؤ گھر گھر کھیلیں اور 14 منتخب کہانیاں	ڈاکٹر ذاکر حسین
نانی کی سنائی ہوئی دلچسپ کہانیاں	ڈاکٹر نعیمہ جعفری
سیرت کوئز (بچوں کے لیے)	ابو امامہ
عشرہ مبشرہ (بچوں کے لیے)	ابو امامہ
بچوں کی اسلامی تاریخی سچی کہانیاں	ابو امامہ
بچوں کی اسلامی کہانیاں	ابو امامہ
بچوں کی سبق آموز کہانیاں	ابو امامہ
بچوں کی تاریخی سچی کہانیاں	ابو امامہ
بچوں کی اچھی اچھی کہانیاں	ابو امامہ
بچوں کی مزاحیہ کہانیاں	ابو امامہ
بچوں کی دلچسپ کہانیاں	ابو امامہ
جھنگا پہلوان کی کہانیاں	ابو امامہ
ٹارزن کے کارنامے اور کہانیاں	ابو امامہ
اکبر بادشاہ اور بیربل کی کہانیاں	ابو امامہ
ایک کہاوت ایک کہانی	ابو امامہ
مثنوی رومی کی کہانیاں	ابو امامہ
گلستانِ سعدی کی کہانیاں	ابو امامہ
بوستانِ سعدی کی کہانیاں	ابو امامہ
امیر حمزہ کی کہانیاں	ابو امامہ
عمرو عیار کی کہانیاں	ابو امامہ
سند باد جہازی کی کہانیاں	ابو امامہ
نامور ادیبوں کی بہترین کہانیاں	ابو امامہ
ایک کتاب میں دو کہانیاں	ابو امامہ
بچوں کا اقبال	ابو امامہ
بچوں کا قائد	ابو امامہ
رسول اللہ ﷺ کی باتیں	ابو امامہ
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی باتیں	ابو امامہ
حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی باتیں	ابو امامہ
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی باتیں	ابو امامہ
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی باتیں	ابو امامہ
حضرت علی رضی اللہ عنہ کی باتیں	ابو امامہ
حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی باتیں	ابو امامہ
حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی باتیں	ابو امامہ
حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی باتیں	ابو امامہ
حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی باتیں	ابو امامہ
حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کی باتیں	ابو امامہ
حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی باتیں	ابو امامہ
شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی باتیں	ابو امامہ

ناشران: بک کارنر شوروم بالمقابل اقبال لائبریری بک سٹریٹ جہلم پاکستان

''میّا'' کے مطالعے سے گزرنے کے بعد میں ہفتوں سو نہیں پایا —— وہ رات بے قراری کی رات تھی۔ میں بالکنی پر آگیا۔ دیر تک ٹہلتا رہا۔ ہاتھوں میں سگریٹ مچلتا رہا۔ ایک کے بعد ایک —— سامنے آسمان کھلا تھا۔ ستاروں کی چادر تنی تھی۔ مگر میں کیا دیکھ رہا تھا۔۔ بہت سے چمکتے، ننھے منے ستاروں میں سے، کسی ایک ستارہ میں، کس کی جھلک دیکھنے کو بیتاب تھا —— اندر کسی گوشے میں چپکے سے ایک آواز تھرائی —— ماں۔۔

ڈیئر حامد سراج!

میں تو فکشن لکھتا تھا ——

تم نے میّا لکھ دی —— ماں کبھی فکشن، نہیں ہوتی۔ ماں تو بس ماں ہوتی ہے۔ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ——

مومن کا زمانہ ہوتا تو کہتا —— ''میرا سارا دیوان لے جاؤ۔ مجھے میّا دے دو۔''

حامد سراج تم نے اردو فکشن کی تاریخ میں 'میّا' لکھ کر ایک ایسا کارنامہ انجام دیا ہے، جو اس سے قبل کسی بھی قلم کار کے حصے میں نہیں آیا تھا۔ میّا فکشن نہیں ہے۔ ایک ایسی درد بھری سچائی ہے، جس سے گزرنا بھی جگر والوں کا ہی کام ہے۔

حامد سراج ——

تم نے تو میّا میں 'صدیاں' رکھ دیں ——

تم نے میّا کو فکشن کی لازوال بلندیوں پر پہنچا دیا ——

حامد سراج —— اتنا تو بتا دو —— کہ تم نے لکھا کیسے؟ —— کوئی بھی فنکار ماں کو کیسے لکھ سکتا ہے۔ ماں تو فکشن ہی نہیں ہے —— اور سچی بات تو یہ ہے کہ ماں کبھی مری ہی نہیں، تم نے تو میّا کو ہمیشہ کے لیے امر کر دیا ہے ——

مشرف عالم ذوقی

دہلی (ہندوستان)

facebook
book corner showroom
website
www.bookcorner.com.pk
email
bookcornershowroom@gmail.com

ISBN: 978-969-662-003-7
Rs. 380.00